

جاسوسی دنیا نمبر 79

چاندنی کا دھواں

(مکمل ناول)

پیشرس

چاندنی کا دھواں تھوڑی تاخیر سے حاضر ہے! تاخیر کی وجہ نہ پوچھئے ورنہ آپ کہیں گے کہ اسے ”علامت“ کے علاوہ آتا ہی کیا ہے۔ اور وہ بھی خصوصیت سے خاص نمبر پیش کرنے کے مواقع پر! مگر میں خود اسے کیا کہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا.... پیر کی ایک معمولی سی خراش سپنگ بن گئی۔ بخار ہوا تو ذہن ہی ناکارہ ہو کر رہ گیا۔ غرضیکہ خاص نمبر لیٹ....!

مگر خیر مجھے خوشی ہے کہ اس بار کی کہانی آپ کے بڑھتے ہوئے انتظار اور اضطراب کے شلیان شان بھی ہے۔ آپ اسے ہر اعتبار سے پسند کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ کیپٹن حمید کو انسپکٹر آصف کے ماتحت کی حیثیت سے دیکھ کر آپ متحیر بھی ہوں گے اور آپ کو ہنسی بھی آئے گی۔ یہ خود کرنل فریدی کی تجویز تھی کہ حمید انسپکٹر آصف کے ماتحت کی حیثیت سے کام کرے لیکن اس افسری اور ماتحتی نے جو گل کھلائے ہیں ان کی مہک آپ اپنے قہقروں میں ہی محسوس کر سکیں گے.... جی ہاں۔ قاسم صاحب بھی تشریف رکھتے ہیں ان کا تو چلن ہی اور ہے۔ سدا کے سادہ لوح ہیں۔ ان پر گزرنے والے حادثات بھی انہی کی طرح انوکھے ہوتے ہیں۔

فریدی ایک ایسی پُر اسرار عورت کے تعاقب میں نظر آئے گا جسے ایک مصور نے کبھی دیکھا نہیں تھا لیکن جس کے برش کے جنبش ہمیشہ اُسی کی شکل بناتی تھیں۔

مصور اُسے آسیب سمجھتا ہے! لیکن پھر بھی مصور کی تصویر بین الاقوامی مقابلے میں اول آتی ہے اور یہیں سے کرنل فریدی کی مصروفیات بڑھ جاتی ہیں۔

وادی کا جبک میں چمکدار دھوئیں کا منارہ زمین سے آسمان تک بلند ہوتا چلا جاتا ہے.... مگر وہ ایک مجبوری تھی۔ اگر وہ مجبوری نہ ہوتی تو شاید کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی کہ وادی کا جبک میں کیا ہو رہا ہے۔ بڑی عجیب بات تھی.... مصور نے اس کی تصویر بنائی اور اُسے ایک آسیب سمجھتا رہا۔ کیپٹن حمید اُسے ایک بھنگی ہوئی روح سمجھتا ہے اور کیوں نہ سمجھتا جبکہ اُس نے اُسے چھو کر دیکھا تھا۔ پھر فریدی کو کیا ہو گیا تھا۔ وہ اس کے لئے ہتھکڑیاں لئے کیوں پھر تا ہے۔

روح اسے شکست دینا چاہتی تھی۔ اُسے احساس بے بسی میں مبتلا کرنا چاہتی تھی۔ لیکن فریدی نے کسی طرح اُسے خود اُسی کی نظروں سے گرا دیا۔ آپ دیکھیں گے اور فریدی کی ذہانت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں گے! خون کا ایک قطرہ گرائے بغیر وہ اس مغرور کو احساس بے بسی میں مبتلا کر دیتا ہے۔

ابن صفیر

آسیب

جیلانی نے برش رکھ دیا۔ تھوڑی دیر تک اپنی بنائی ہوئی تصویر کو خوفزدہ نظروں سے دیکھتا رہا پھر دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر آرام کرسی میں گر گیا۔

اس کا سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں میں دھند سی چھا رہی تھی۔ اُس دھند میں چنگاریاں بھی تھیں جو لاتعداد جگنوؤں کی طرح ٹٹماتی پھر رہی تھیں.... پھر یہ دھند آہستہ آہستہ گہری تاریکی میں تبدیل ہوتی گئی اور کچھ دیر بعد اس تاریکی میں رہ رہ کر تیز روشنی کے جھماکے ہونے لگے۔

ان جھماکوں میں پل بھر کے لئے کبھی گرجوں کی چوٹیاں کبھی مسجدوں کے منارے اور کبھی اونچی اونچی عمارتوں کی چھتیں نظر آتیں اور پھر تاریکی میں کھو جاتیں! یہ روشنی کے جھماکے اس کے ذہن پر ٹھوکریں سی مارتے اور اس کا سارا جسم جھنجھٹا اٹھتا۔

یہ کیفیت نئی نہیں تھی۔ جب بھی اس کے برش سے وہ مخصوص چہرہ ابھرتا تھا اُس کے ذہن کی یہی حالت ہو جاتی تھی۔ وہ ایک اچھا مصور تھا اب تک کئی قومی مقابلوں میں حصہ لے چکا تھا۔ نیشنل آرٹ گیلری میں اس کی بنائی ہوئی تصاویر کو بھی جگہ ملا کرتی تھی.... لیکن پچھلے تین سال سے اس نے انسانی تصاویر بنانا چھوڑ دیا تھا.... اب صرف جانوروں پرندوں اور مناظر کی تصویر کشی کرتا تھا۔ ایسا کیوں ہوا تھا؟ اس کی وجہ وہ تصویر تھی جو اس وقت بھی ایزل پر موجود تھی اور جس کے خوف سے اس نے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔

مگر یہ تو کسی دلکش عورت کی تصویر تھی۔ ایسی کہ ایک بار دیکھنے کے بعد اس پر سے نظر ہٹانے ہی کو دل نہ چاہے۔ آدھ کھلی خواہناک آنکھیں۔ خفیف سے کھلے ہوئے بھرے بھرے سے ہونٹ جن کے درمیان چمکدار دانتوں کی ہلکی سی جھلک بھی دکھائی دیتی تھی۔

مگر وہ اُس سے خائف تھا۔ کیونکہ وہ جب بھی کوئی انسانی چہرہ بناتا تھا بالکل یہی خط و خال اُس کے برش سے نکلتے تھے۔ یہی صورت ہوتی تھی۔ وہ کوشش کرتا کہ کوئی دوسری شکل بنائے لیکن اس مخصوص چہرے سے پہچانہ چھڑا سکتا۔ شروع شروع میں یہ چہرہ اُسے بے حد پیارا لگا تھا۔ لیکن جب یہ کسی بھوت کی طرح اُس کے برشوں سے چٹ گیا تو اسے الجھن ہونے لگی۔ اُس کے تصور ہی سے اختلاف ہونے لگا اور اس نے تھک ہار کر انسانی تصاویر بنانا ہی ترک کر دیا۔

اس کے خطوط میں بڑی زندگی تھی۔ وہ جہاں بھی وہ رنگ لگا دیتا بس بول ہی پڑتا تھا۔ اس کے ہم عصر پختہ کار اور عمر رسیدہ مصور بھی اُسے رشک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ جیلانی کی عمر اٹھائیس سے زیادہ نہیں تھی۔ لیکن اُس کے بارے میں کہنے مشق اور تجربہ کار مصوروں کا خیال تھا کہ وہ ماں کے پیٹ ہی سے ہاتھ میں برش دبائے آیا ہوگا۔

اُس کی شناسا عورتیں سوچتی تھیں کہ وہ خود بھی آرٹسٹ ہے۔ قدیم یونانی کے کسی ماہر فنکار کا تراشا ہوا مجسمہ نزاکت اور قوت کا حسین ترین امتزاج! آج سے تین سال قبل دولت مند گھرانوں کی رنگین مزاج عورتیں محض اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے اُسے پوز دیا کرتی تھیں۔ گھنٹوں اُس کے قریب بیٹھی رہتیں اور وہ اُن کی تصاویر میں رنگ بھر کر تا۔

انہیں دنوں کی بات ہے وہ ایک بار ایک اچھے گھرانے کی عورت کی تصویر بنا رہا تھا۔ عورت پوز دے رہی تھی جب وہ اس دن کا کام ختم کر چکا تو عورت اٹھ کر ایزل کے قریب آئی۔ تصویر کو نزدیک سے دیکھا اور اس پر برس پڑی کہ خواہ مخواہ اس کا اتنا وقت برباد ہوا۔ عورت کھرے مزاج کی تھی۔ جیلانی کو اس کے خیال دلانے پر ہوش سا آگیا اور اب اس نے بھی غور سے دیکھا تو وہ اس عورت کی تصویر ہر گز نہیں تھی۔ اُس نے عورت سے معذرت طلب کی اور اب تک کی محنت پر سفیدہ پھیر دیا۔ تصویر از سر نو شروع ہوئی۔ لیکن پھر وہی خط و خال ابھر آئے جو اس سے پہلے عورت کی بر فرد خنگی کا باعث بنے تھے اس بار وہ خفا ہو کر اسٹوڈیو سے چلی ہی گئی تھی۔ پھر جیلانی کو سکون نہ مل سکا۔ وہ چہرہ کسی بھوت کی طرح اُس سے چٹ کر رہ گیا تھا۔ جب بھی کوئی تصویر بنانے بیٹھا برش کی جنبش وہی خط و خال ابھار کر رکھ دیتیں اور اس کا سر چکرانے لگتا آخر تھک ہار کر اُس نے انسانی تصاویر بنانی ہی چھوڑ دیں۔

مگر چونکہ مشاق فنکار تھا اس لئے دوسری راہوں میں بھی اُس نے اپنی انفرادیت کے

جھنڈے گاڑ دیے اب بھی اس کی شہرت کا وہی عالم تھا۔ لیکن اب ان عورتوں کی بھیڑ اس کے گرد نہیں رہتی تھی جو تصویر بنوانے کے بہانے ہی اُس سے قریب ہونا چاہتی تھیں۔ اس سے اس کی مالی حالت پر بڑا اثر پڑا تھا اور ایک سال کے اندر ہی اندر اُسے وہ خوبصورت بنگلہ چھوڑ دینا پڑا تھا جس میں وہ کافی ساز و سامان کے ساتھ رہتا تھا۔ کیونکہ اب وہ اتنا مالدار نہیں رہا تھا کہ ڈھائی صد روپے ماہوار کرایہ ادا کر سکتا۔

اُسے ایک چھوٹے موٹے مکان کی تلاش تھی۔ لیکن اکیلے آدمیوں کو چھوٹے موٹے مکان کہاں ملنے لگے۔ وہ دن رات اُن محلوں کے چکر لگاتا رہتا جہاں متوسط طبقہ کے لوگ آباد تھے کئی مکان خالی ملے بھی لیکن شرط تھی پورے خاندان کی یعنی ”گھر والی“ کے بغیر مکان ماننا ممکن تھا۔

”میری گھر والی کا نام شامت ہے۔“ وہ مسکرا کر مالک مکان سے کہتا اور آگے بڑھ جاتا۔ ایک دن وہ ایک بستی میں پہنچا جہاں کے متعلق اُسے معلوم ہوا تھا کہ مکان مل ہی جائے گا! کیونکہ وہاں زیادہ تر آزاد خیال قسم کے متوسط گھرانے آباد تھے۔ وہاں ایک دو منزلہ مکان ایسا مل بھی گیا جن میں اوپری منزل پر خود مالک مکان رہتا تھا اور نگلی منزل کرائے کے لئے خالی تھی۔

مالک مکان نے اُسے اپنے ڈرائنگ روم میں ریسیور کیا۔ وہاں کچھ اور لوگ پہلے ہی سے موجود تھے۔ چند خواتین بھی تھیں۔ مالک مکان نے سب سے پہلے اُس سے سوال کیا کہ اُس کے پاس کار بھی ہے یا نہیں! کبھی ہوا کرتی تھی کار بھی لیکن.... مالی بد حالی کی وجہ سے اُسے بھی فروخت کر دینا پڑا تھا۔ اس لئے جیلانی سے نفی میں جواب پا کر اُس نے کہا نگلی منزل میں گیراج بھی ہے اس لئے وہ کسی کار والے ہی کے لئے مناسب رہے گا اور اس طرح کرائے میں اضافہ بھی کیا جاسکے گا۔

جیلانی کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اتنے میں ایک صاحبہ نے اس سے سوال کیا کہ کیا وہ خود اپنے لئے مکان تلاش کر رہا ہے۔ جیلانی سے اثبات میں جواب سن کر ان کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے تھے۔ مگر وہ کچھ بولی نہیں تھیں۔ پھر جب جیلانی چلنے لگا تھا تو دفعتاً انہوں نے اپنا وزینگ کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا ”کل شام کو اس پتہ پر تشریف لائیے میرا خیال ہے کہ میں آپ کو ایک مکان دلوا سکوں گی۔“

جیلانی اُن کا شکریہ ادا کر کے اٹھ آیا تھا۔ یہ ادھیڑ عمر کی ایک پُر وقار اور سنجیدہ خاتون تھیں۔

بیگم تنویر۔ ایک مقامی گز لڑکائی میں پرنسپل تھیں۔ جیلانی دوسرے دن اُن کے یہاں پہنچ گیا تھا۔
 ”میں آپ سے بخوبی واقف ہوں۔“ بیگم تنویر نے کہا۔ ”آپ جیلانی صاحب ہیں۔ لیکن مجھے حیرت ہے کہ آپ چھوٹے موٹے مکان کی تلاش میں کیوں ہیں۔ جب کہ آپ کے پاس اتنا شاندار بنگلہ ہے اور آپ کی یہ بات بھی درست نہیں آپ کے پاس کار نہیں ہے۔“
 ”میرے پاس بنگلہ بھی تھا.... اور کار بھی۔ لیکن محترمہ اب کچھ بھی نہیں ہے اب مجھے ایک معمولی سا مکان چاہئے۔ جس کا کرایہ میری قلیل آمدنی برداشت کر سکے۔“

”مجھے حیرت ہے....!“

”جب تک زمین گردش کر رہی ہے سب کچھ ممکن ہے محترمہ....!“

”خیر....!“ بیگم تنویر نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ”میرے مکان کی اوپری منزل خالی ہے۔ اگر آپ کے کسی کام آ سکے۔“

”میں بے حد مشکور ہوں گا محترمہ.... میں صرف ایک کمرے سے بھی کام چلا سکتا ہوں۔“
 بس پھر وہ دوسرے ہی دن تنویر منزل میں اٹھ آیا تھا۔ بیگم تنویر بیوہ تھیں اور اس عمارت میں تنہا ہی رہتی تھیں۔ بہر حال یہاں کا ماحول بہت پرسکون تھا اور یہی چیز جیلانی کے لئے سب سے زیادہ اہم تھی۔ کیونکہ وہ ایسی ہی فضا میں جم کر کام کر سکتا تھا۔

لیکن اس کا یہ سکون زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہ سکا۔ تنویر منزل میں وہ لڑکی نہیں آئی تھی بلکہ زلزلہ آگیا تھا۔ وہ طوفان بدتمیزی برپا رہتا کہ خدا کی پناہ۔ صوفیہ بیگم تنویر کی کوئی عزیز تھی کسی دوسرے شہر سے اس نے میٹرک پاس کیا اور اب اعلیٰ تعلیم کے لئے بیگم تنویر کے پاس چلی آئی تھی۔ عمر اٹھارہ سے زیادہ نہ ہی ہوگی۔ سنجیدگی شاید اُس کے قریب سے بھی نہیں گذری تھی۔ ہر وقت ہنستے ہنساتے رہنا اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا اور جیلانی کو تو وہ ”شامت“ ہی کی طرح گھیرے رہتی تھی۔

جیلانی اس سے بھاگنا چاہتا تھا لیکن بھاگنے کی صورت میں سر سے چھت کا سایہ بھی جاتا۔ مجبوراً اب اسی ہنگامہ پر ورماحول ہی میں بسر کرنی پڑتی۔

موجودہ الجھن کا باعث بھی یہی لڑکی بنی تھی۔ اُس نے اُسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ انٹرنیشنل آرٹ ایگزپیشن کے لئے کوئی انسانی تصویر بنائے ورنہ وہ تو ایگزپیشن کے لئے ایک منظر پیش

کر رہا تھا.... یہ شفق کی چھاؤں میں ساحل کی ریت پر پڑے ہوئے تین گھونگھے تھے۔ صوفیہ نے یہ تصویر دیکھ کر ایک چھت شکاف قہقہہ لگایا تھا اور بولی تھی۔ ”جیلانی صاحب اگر اس منظر میں چوتھے آپ بھی شامل ہو جائیں تو تصویر بڑی جاندار ہو جائے گی۔“

اس دلچسپ جملے پر وہ بھی دل کھول کر ہنسا تھا۔ مگر پھر تو وہ سر ہی ہو گئی۔ اس منظر پر سفیدے کا برش پھر داکر ہی دم لیا۔

آخر جیلانی نے جھلا کر کہا تھا۔ ”بیٹھو میں تمہاری ہی تصویر بناؤں گا۔“

اُس نے سوچا تھا کہ سر اس کا اور دھڑ بندر کا بنا کر لمبی سی دم کھینچ دے گا۔ وہ بھی تاؤ میں آکر بیٹھ گئی تھی۔ اور وہ اس کے چہرے کا اسکیچ لینے لگا تھا۔ تین سال بعد انسانی خط و خال پر اس کی پینسل دوڑی تھی۔ وہ بڑے انہماک کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہا۔ اُسے یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ صوفیہ کب اپنی جگہ سے اٹھ کر اُس کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھی۔

دفعۃً وہ اس کے قہقہے پر چونک کر مڑا۔

”اب اتنے مشتاق بھی نہیں معلوم ہوتے کہ کھڑے گھاٹ کسی کی تصویر بناؤ الو۔“ اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”واہ.... کیا خوب۔ یہ میری تصویر ہے۔ ابھی آپ کو مشق کی ضرورت ہے جیلانی صاحب۔“
 جیلانی نے تصویر پر دوبارہ نظر ڈالی تھی اور اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں پھوٹ آئی تھیں۔ کیونکہ یہ تو وہی تصویر تھی.... وہی آسب تھا جس نے تین سال پہلے نہ صرف اُسے بلکہ اُس کے فن کو بھی دوسری راہوں پر ڈال دیا تھا۔

وہی آدھ کھلی آنکھیں وہی خفیف سے کھلے ہوئے ہونٹوں سے جھانکنے والے تین دانت۔

”مگر تصویر ہے.... بڑی پیاری....!“ صوفیہ نے کہا تھا۔

”جاؤ....!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”مجھے تنہا چھوڑ دو۔ میرا سر چکرا رہا ہے.... میں

شاید بیمار ہو جاؤں....!“ پھر وہ مذہال سا ہو کر آرام کرسی میں گر گیا تھا۔

صوفیہ اُس کے کمرے سے چلی گئی تھی۔

اس دن سے جیلانی پر جنون سا طاری ہو گیا تھا۔ وہ چہرے بنا بنا کر بگاڑتا رہتا ان چہروں میں بال برابر بھی فرق نہ ہوتا۔ بعض اوقات وہ تہیہ کر کے بیٹھتا کہ اُس چہرے کا کارٹون ہی بنا کر رکھ

دے گا۔ لیکن برش کی پہلی ہی جنبش کے ساتھ اُس کا ذہن ہاتھ سے دور بھاگنے لگتا اور نتیجہ دہی ہوتا۔۔۔۔۔ یعنی وہ تصویر۔۔۔۔۔

صوفیہ تو آج ہی اُس سے اس کے چہرے کے متعلق پوچھ بیٹھی تھی۔ لیکن اُس نے اسے تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا کہ وہ تصویر محض تخیلی ہے۔

”اچھا چلو یہی سہی کہ میں اس عورت کو جانتا ہوں۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔!“

”وہ بہت بُری طرح تمہارے ذہن پر چھائی ہوئی ہے۔“

”چلو۔۔۔۔۔ یہ بھی تسلیم ہے پھر۔۔۔۔۔!“

”پھر کیا! کچھ بھی نہیں۔“ صوفیہ کی آواز میں اضطراب تھا۔

پھر وہ اس کے کمرے سے چلی گئی تھی۔

آج اس نے آخری بار برش اٹھایا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ کوئی دوسرا چہرہ نکالنے کی کوشش کی جائے۔ اگر نکل سکا تو ٹھیک ہی ہو گا اور اگر وہی چہرہ بنا تو پھر اب وہی تصاویر کی بین الاقوامی نمائش میں بھیجا جائے گا۔

مگر وہ کسی طرح بھی دوسرا چہرہ نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔۔۔۔۔ دیے ایک عجیب سی بات یہ تھی کہ برش ہاتھ میں لیتے ہی اس کا ذہن قابو میں نہیں رہ جاتا تھا۔ اگر انسانی تصویر بنانے کا ارادہ ہوتا۔ بہر حال اس کا یہ آخری فیصلہ بھی برش کی مخصوص جنبشوں میں کوئی تبدیلی نہ کر سکا۔ پھر وہی چہرہ تیار تھا۔

کچھ دیر تک اُس کے ذہن پر ہیجانی کیفیت طاری رہی پھر آہستہ آہستہ پرسکون ہوتا گیا۔

”اب یہی تصویر جائے گی۔۔۔۔۔ اب یہی تصویر جائے گی۔۔۔۔۔!“ وہ دفعتاً مضطربانہ انداز میں بڑبڑایا اور کیونوس پر بنے ہوئے چہرے کو گھورتا ہوا بولا۔ تم مجھے خوفزدہ نہیں کر سکتیں میں اب تمہیں بازار میں لاؤں گا۔۔۔۔۔ بازار میں لاؤں گا۔ سمجھیں! میں جانتا ہوں تم کوئی بُری روح ہو۔ میرے ہاتھوں سے چٹ کر رہ گئی ہو۔۔۔۔۔ لیکن اب میں تم سے نہیں ڈروں گا، تمہیں بھی سکون نہیں لینے دوں گا۔۔۔۔۔ سو رکھ دیا۔“

وہ خاموش ہو گیا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس چہرے کو کسی منظر میں کھپانا چاہئے۔۔۔۔۔ اوہ ٹھیک ہے چرواہی۔۔۔۔۔ ایک چیتھرے لگائے ہوئے۔۔۔۔۔ چرواہی۔۔۔۔۔ مفلوک الحال۔۔۔۔۔ بیابانوں کی خاک

چھاننے والی۔۔۔۔۔ بھوک اور پیاس سے غدھال۔۔۔۔۔!

یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔۔۔ بابا۔۔۔۔۔ اُس نے قہقہہ لگایا۔ ”میں تمہیں کتوں سے نچاؤں

گا۔۔۔۔۔ جتنا ذلیل کر سکتا ہوں کروں گا۔۔۔۔۔ دیکھو گا کہ تم میرا کیا بگاڑ لیتی ہو۔“

خاموش ہو کر اس نے برش اٹھائے اور رنگوں کی ٹرے پر نظر دوڑانے لگا۔

اتنے میں صوفیہ آگئی اس کی نظر کیوناس پر تھی۔

”اوہ۔۔۔۔۔ پھر وہی۔“ اس نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

”ہاں پھر وہی۔۔۔۔۔!“ جیلانی مسکرا کر بولا۔ اُس کی آنکھیں سرخ اور خوفناک تھیں۔

”تم اس کے علاوہ اور کسی قسم کا چہرہ بنا ہی نہیں سکتے۔“ صوفیہ نے جلعے لہجے میں کہا۔

”بہترے مصوروں میں یہ کمزوری ہوتی ہے۔۔۔۔۔ پتہ نہیں تمہیں بین الاقوامی نمائش کے لئے کیسے دعوت مل گئی۔“

”ہاں میں بالکل گدھا ہوں۔۔۔۔۔ پھر تم سے کیا۔۔۔۔۔ جاؤ یہاں سے۔“

”نہیں جاؤں گی۔۔۔۔۔“ وہ اطمینان سے ایک آرام کرسی میں نیم دراز ہوتی ہوئی بولی۔ ”تم

ایک اچھے کمرشل آرٹسٹ بن سکتے ہو۔ کیون خواہ خواہ اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔“

کمرشل آرٹ جیلانی کے لئے گالی تھی۔ وہ تمللا کر رہ گیا۔ لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔

کل کی چھو کر جیسے مصوری کی اسے۔۔۔۔۔ جی سے بھی واقفیت نہیں تھی اُسے مشورہ دینے

چلی تھی جو اپنا نچلا ہونٹ چباتا ہوا تصویر پر کام کرنے لگا۔

”میرے ایک کزن آرٹسٹ ہیں۔۔۔۔۔!“ وہ کچھ دیر بعد بولی۔ ”واہ۔۔۔۔۔ کیا تصویریں بناتے

ہیں۔ بس دیکھتے ہی رہ جاؤ۔ تصویریں بول پڑتی ہیں۔ ایک دن انہوں نے اپنی بوڑھی ماما سے کہا چل

تجھے ملکہ بنا دوں۔ بس اس کی تصویر بنا کر ملکہ وکٹوریہ کے کپڑے پہنا دیے۔“

”میں نے کئی جگہ ایسے بھی دیکھے ہیں جو اپنے پیٹ سے درجنوں لوہے کے گولے نکال پھینکتے

ہیں۔“ جیلانی نے اُس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”مگر افسوس تمہارے جھولے میں صرف یہی ایک تماشہ ہے۔“ وہ کیوناس کی طرف انگلی

اٹھا کر بولی۔

”میں کہتا ہوں تم جاؤ یہاں سے۔ مجھے کام کرنے دو۔“ جیلانی دانت پیس کر بولا۔

”نہ میں تمہارے کاندھے پر سوار ہوں اور نہ میں نے تمہارے کان پکڑ رکھے ہیں۔ سچے آرٹسٹ کی یہ بھی پہچان ہے کہ کام کرتے وقت اُسے گرد و پیش کی خبر نہ ہو۔۔۔۔۔ وہ تو اپنے آرٹ میں ڈوبا رہتا ہے۔ اُسے کیا پتہ کہ آس پاس کیا ہو رہا ہے۔“

”دیکھو! مجھے پریشان مت کرو۔“ جیلانی نے بے بسی سے کہا۔

”خدا کی پناہ۔۔۔۔۔ کتنی دور بیٹھی ہوں تم سے۔“

”میں بیگم تنویر سے شکایت کروں گا۔“

”اوں۔۔۔۔۔ ہوں۔۔۔۔۔!“ وہ سر ہلا کر سنجیدگی سے بولی۔ ”ان کے قریب بھی مت جانا ورنہ وہ چیخ مار کر بھاگیں گی۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“

”ان کا خیال ہے کہ تمہارا دماغ الٹ گیا ہے۔“

”کیا بکواس ہے۔“

”میں کیا جانوں۔۔۔۔۔ وہ خود ہی کہہ رہی تھیں۔“

”کیا کہہ رہی تھیں۔“

”ارے بھی انہوں نے کئی بار تمہیں تصویروں سے گفتگو کرتے اپنے بال نوچتے اور سر پر گھونٹے مارتے دیکھا ہے۔“

”سب تمہاری شرارت ہے صوفیہ۔۔۔۔۔ آخر تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔ میں نے تمہارا کیا لگاڑا ہے۔“

”میں کب کہتی ہوں کہ تم نے لگاڑا ہے۔ مگر میں کیوں تمہارے پیچھے پڑنے لگی۔“

”پتہ نہیں یہ تم ہی جانتی ہو گی۔۔۔۔۔!“ جیلانی نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

”تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر تھوڑی دیر بعد وہ بولی۔ ”میں کچھ پوچھ سکتی ہوں۔“

”اس چہرے کے علاوہ۔۔۔۔۔ میں کتنی بار کہوں کہ میں نے آج تک ایسی کوئی عورت نہیں دیکھی۔“

”یہ ناممکن ہے۔ میں اسے بھی تسلیم نہ کروں گی! یہ اس بُری طرح تمہارے ذہن پر چھا گئی ہے کہ اب تمہارے ہاتھوں سے کوئی دوسرا چہرہ بن ہی نہیں سکتا۔“

”کچھ بھی ہو! میری یادداشت میں ایسی کوئی عورت نہیں ہے! کبھی نہیں تھی۔ یہ ایک

آسیب ہے جس نے میری زندگی برباد کر دی۔ مجھے تباہ کر دیا۔ اسی کی بدولت جیلانی اس حال کو پہنچا ہے اب اُسے ڈر ہے کہ کہیں وہ اس چھت کے سائے سے بھی محروم نہ ہو جائے۔“

”میں نہیں سمجھی۔“

”میں بھی نہیں سمجھا۔ اتنا نہیں سمجھا کہ تمہیں بھی سمجھا سکوں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو! صوفیہ مجھ پر رحم کرو۔“

”یہ اکثر تمہیں خواب میں بھی نظر آتی ہو گی۔ اگر آسیب ہے۔“

”اکثر۔۔۔۔۔! وہ۔۔۔۔۔ میں کیا کروں۔“ جیلانی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

”یوسف زلیخا۔۔۔۔۔ میں نے بھی پڑھی ہے۔“ وہ ہنس پڑی۔

”جاؤ۔۔۔۔۔!“ وہ گھونٹہ اٹھا کر اس کی طرف دوڑا اور وہ آرام کرسی سے اٹھ کر دروازے کی جانب بھاگی۔

پھر دروازہ بند ہونے کی تیز آواز کمرے میں گونج کر رہ گئی۔

جیلانی دیوار سے لگا کھڑا ہانپ رہا تھا اور اس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔

انوکھی ٹیم

محکمہ سرانجام رسانی کے کمرہ مشاورت میں وادی کا جیک کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ وادی کا جیک کے اوپر والے سرحدی علاقے میں ایک حیرت انگیز اطلاع ملی تھی! چونکہ یہ اطلاع ایک سرحدی حفاظتی چوکی سے آئی تھی اس لئے اس پر سنجیدگی سے غور کیا جا رہا تھا۔

”وادی کا جیک کا محل وقوع۔۔۔۔۔!“ سپرنٹنڈنٹ دوسرے آفیسروں سے کہہ رہا تھا۔ ”ایسا ہے کہ وادی دشوار گزار بن کر رہ گئی ہے۔ کیا آپ لوگوں میں سے کسی صاحب کو اُدھر جانے کا اتفاق ہوا ہے۔“

کسی نے بھی اس سوال کا جواب نہ دیا۔

”بہر حال۔۔۔۔۔!“ سپرنٹنڈنٹ کچھ سوچتا ہوا اپنا پایاں گال کھجا کر بولا۔

”ہیلی کوپٹر کے علاوہ اور کوئی چیز نیچے نہیں لے جاسکتی۔ ہزاروں فٹ کی گہرائی میں یہ وادی

واقع ہے۔ اور نیچے بڑے گھنے جنگل پھیلے ہوئے ہیں۔“
وہ پھر خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

”تو یہ دھوکین کا مینار....!“ اُس کے ایک نائب نے ٹوکا۔

”میری دانست میں یہ بڑی مضحکہ خیز بات ہے۔ دیکھنے والا اُس وقت تنہا تھا۔ چاندنی رات

تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ نشے میں رہا ہو۔“

کئی لوگوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آئی.... حمید بھی مسکرایا تھا۔ مگر کرئل فریدی کی سنجیدگی میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔

”کچھ بھی ہو۔“ سپرنٹنڈنٹ پھر بولا۔ ”ہمیں بہر حال دیکھنا ہی پڑے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ

کوئی مناسب آدمی یا ٹیم اس سلسلے میں چھان بین کرے۔“

”لال بھکھو آصف کے علاوہ اور کون مناسب ہو گا۔“ انسپکٹر صاحب نے آہستہ سے کہا۔

مخاطب کوئی بھی نہیں تھا۔

وہ سبھی جانتے تھے کہ کرئل فریدی کے علاوہ اور کوئی نہیں بھیجا جائے گا۔

دفتر سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ ”ہاں کرئل فریدی آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔“

”اگر آپ مناسب سمجھیں تو ٹیم میں منتخب کردوں۔“ فریدی نے اٹھ کر کہا۔

”آپ مجھے ایک الجھن سے بچالیں گے۔“ سوپر مسکرایا۔

”انسپکٹر آصف اور کیپٹن حمید۔“ کرئل فریدی نے کہا اور حاضرین کے چہروں پر حیرت کے

آثار صاف نظر آنے لگے۔ آصف تو خصوصیت سے کچھ اس انداز میں فریدی کی طرف دیکھ رہا تھا

جیسے کسی نے اچانک فریدی کے پاگل ہو جانے کی اطلاع دی ہو۔ حمید نے اپنے ہونٹ بھیجے لئے

تھے، اس کی آنکھوں میں شرارت آمیز چمک لہرا رہی تھی۔

”اس انتخاب کی وجہ....!“ سوپر بھی مسکرایا۔

”آصف صاحب تجربہ کار ہیں اور حمید کسی چپے کی طرح پھر تپتا ہے۔“

آصف کی تھوڑی سی نیچے کا گوشت لٹک آیا۔ کیونکہ اُس نے بڑی سختی سے گردن اکڑائی تھی۔

سوپر کسی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد سر ہلا کر بولا۔ ”ٹھیک ہے کیپٹن حمید مسٹر

آصف کو اسسٹ کریں گے۔“

”بہت مناسب ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اور حمید کی کھوپڑی بھک سے اڑ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فریدی اُسے گدھوں کا اسٹنٹ بننے پر بھی مجبور کرے گا۔ دوسری طرف آصف اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر فریدی کو دیکھ رہا تھا جیسے اُسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ہو۔ یہ مسئلہ اس طرح طے ہو گیا۔“

میننگ برخواست ہونے پر وہ سب کا من روم میں اکٹھا ہوئے اور یہ انتخاب موضوع بحث بن گیا۔ آصف بہت خوش نظر آ رہا تھا اس نے کرئل سے کہا۔

”یار تم نے خواہ مخواہ مجھے پھنسا دیا۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ ہم سب سے سینئر ہیں۔“ فریدی نے جواب دیا۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر اب مجھ سے دوڑ دھوپ نہیں ہوتی۔“

”حمید آپ کو غیر ضروری دوڑ دھوپ سے بچائے گا۔“

”مگر میں بیہودگیاں نہیں پسند کرتا۔“

”اس میں ہمت نہیں ہے کہ اپنے آفیروں کے سامنے بیہودگیاں پھیلا سکے۔“

”وہ مجھے آفیسر کب سمجھتا ہے....!“

”لیکن اس مخصوص موقع پر وہ آپ کو اسسٹ کرے گا وہ سوپر کی طرف سے آپ کی ماتحتی میں دیا گیا ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے اس افواہ کے متعلق۔“

”ہو سکتا ہے کہ افواہ حقیقت ہی ثابت ہو۔“

”بات کیا بنے گی۔“ آصف نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”دھوکین کا مینار میری سمجھ میں تو نہیں آتا۔“

”کیا کبھی کسی فلم میں بھی راکٹ کی اڑان دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔“ فریدی نے مسکرا کر پوچھا۔

”ارے راکٹ تو ترچھے اڑتے ہیں۔“

”ضروری نہیں ہے کسی خاص نشانے پر پھینکے جانے والے راکٹ ترچھے اڑتے ہیں۔ لیکن اُن راکٹوں کی اڑان سیدھی سی تھی جو مصنوعی سیارے لے کر فضا بے بیٹ میں گئے تھے۔“

”تو تمہارا خیال ہے کہ وہ چمکدار منارہ کسی راکٹ سے خارج ہونے والی گیس ہوگی۔“

”اس کا امکان ہے۔ فی الحال اس سلسلے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔“

حمید ایک گوشے میں خاموش بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔ ان دونوں کو یکجا دیکھ کر وہ سانپ کی طرح ہچکھکارتا ہوا اٹھا۔ نہ جانے کیوں آصف نے اسے آتا دیکھ کر کھسک جانا ہی مناسب سمجھا تھا۔

”ہاں تو میں کسی چیتے کی طرح پھر تیتلا ہوں۔“ حمید نے ٹھنڈی سانس لے کر دردناک لہجے میں کہا۔ ”اور وہ کسی سانحہ گدھے کی طرح اداس.... ار.... مطلب یہ کہ تجربہ کار ہے۔“

”پھر تم کہنا کیا چاہتے ہو۔“ فریدی نے خشک لہجے میں پوچھا۔

”اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ کہیں آصف کے کفن دفن کا بار آپ ہی پر نہ آ پڑے۔“

”میں کہتا ہوں تمہیں اُسے اسٹ کرنا ہی پڑے گا۔“

”میں نے انکار تو نہیں کیا۔ البتہ آپ کو ایک خطرے سے ضرور آگاہ کیا ہے۔“

”بکواس مت کرو۔ تمہیں کل صبح ٹرین سے روانہ ہونا ہے۔“

”میں پوچھتا ہوں آخر اس جدت کی ضرورت ہی کیا تھی۔“

”وقتی ضرورت.... اگر میں یہ تجویز پیش نہ کرتا تو تان مجھ پر ہی ٹوٹی، لیکن میں آج کل

شہر نہیں چھوڑ سکتا۔“

”کیوں....؟“

”کچھ لوگوں کی خواہش ہے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔“

”آپ ہمیشہ سنسنی خیز خبریں سناتے ہیں۔ خیر میں تفصیل نہیں پوچھوں گا۔ فی الحال تو آپ

اس معاملے کی گفتگو کیجئے۔“

”سنو! ہو سکتا ہے کہ یہ محض افواہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ صداقت پر مبنی ہو۔ اس لئے میں

چاہتا ہوں کہ تم آصف کو اسٹ کرو۔ بات بھی بن جائے گی اور میں شہر ہی میں رہوں گا۔“

”آخر کون آپ کو یہاں سے ہٹانا چاہتا ہے۔“

”ہے ایک آدمی۔ وہ مجھے اپنے ایک نجی کام سے جنوبی امریکہ بھیجنا چاہتا ہے۔ اس کا دعویٰ

ہے کہ وہ مجھے چھ ماہ کی چھٹی بھی دلوادے گا۔“

”اوہ....!“ حمید کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ ”میا آپ نے انکار کر دیا ہے۔“

”قطعی طور پر....!“

”تب تو یہ افواہ بھی ہو سکتی ہے.... مگر مجھے تو پوری بات بھی نہیں معلوم.... کیا قصہ تھا۔“

میں ذرا دیر سے پہنچا تھا۔“

”واوی کا جیک میں ادھر کئی دنوں سے چنکدار دھوئیں کا منارہ سادیکھا جا رہا ہے جو زمین کی سطح سے نامعلوم بلندیوں تک اٹھتا چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر تک دھوئیں کا حجم جامد سا رہتا ہے پھر بڑھنے لگتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کا پھیلاؤ تاریکی میں مدغم ہو جاتا ہے۔“

”راکٹ....!“

”ہو سکتا ہے۔“

”چاندنی وغیرہ کی بات تھی۔“

”بتانے والے نے تھوڑی سی شاعری کر ڈالی تھی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے چاندنی سمٹ کر دھوئیں کی شکل میں تبدیل ہو گئی ہو۔“

”چاندنی کا دھواں.... واقعی بڑا شاعرانہ خیال ہے۔ کسی حیرت انگیز کہانی کا عنوان بھی بن سکتا ہے۔“

”بس تو تم آصف کے ساتھ جاؤ گے۔“

”لیکن یادو مجھے واپس لائے گا یا میں اُسے واپس لاؤں گا۔“

”بے تکی باتیں نہ کرو۔“

”وہ ویسے ہی مجھ پر اپنی سنیارٹی جتانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔“

”میں تمہیں خالص گدھا سمجھوں گا اگر تم اُسے ہینڈل نہ کر سکو۔“

”یہ بات ہے۔“ حمید آستین چڑھاتا ہوا بولا۔

”قطعی! تمہاری صلاحیتوں کا امتحان بھی مقصود ہے۔ میں دیکھوں گا کہ میری محنت کس حد تک بار آور ہوتی ہے۔“

”باری بار.... آور ہی آور.... دیکھ لیجئے گا۔“

اس غیر متوقع ٹیم پر دن بھر چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔

انسپکٹر مزددار نے آصف کو کینٹین میں جا پکڑا.... آصف دوسرے چند انسپکٹروں کو انٹرٹین کر رہا تھا۔ اور لیفٹیننٹ سعید کا خیال تھا کہ آج وہ لوگ پتھر میں جوک لگانے میں کامیاب ہو گئے ہیں! اور نہ آصف اور کینٹین! اس کی کنجوسی دوردور تک مشہور تھی۔

”یار یہ کیسے ہو گیا۔“ مزدار نے آصف سے پوچھا۔

”ارے.... واہ آؤ آؤ.... تم کہاں رہ گئے تھے۔“ آصف نے ہنس کر کہا۔ ”آج یہ

صاحبزادے سعید صاحب چائے پلا رہے ہیں۔“

”پچاؤں کی موجودگی میں بھتیجے ایسی جسارت نہیں کر سکتے۔“ سعید بولا۔

”خیر.... خیر.... دیکھا جائے گا۔“ آصف بے ڈھنگے پن سے ہنسنے لگا۔

”مگر سنو تو سہی۔“ مزدار بولا۔ ”کیا یہ حمید تمہاری سنے گا۔“

”اُس کے فرشتے بھی سنیں گے۔“ آصف کی آنکھیں نکل پڑیں۔

”مجھے تو کچھ گزربڑ معلوم ہوتی ہے۔“ مزدار نے معنی خیز انداز میں اپنی آنکھوں کو گردش

دی۔ ”آخر فریدی ہی نے یہ تجویز کیوں پیش کی تھی۔ تم اکثر اسے جلی کٹی سناتے رہتے ہو۔ کہیں وہ

تمہیں سبق نہ دینا چاہتا ہو۔“

”مر گئے سبق دینے والے۔“ آصف ہاتھ ہلا کر بولا۔ ”کل کے لونڈے مجھے سبق دیں گے۔“

”سبق تو وہ پورے محکمے کو دیتا رہتا ہے۔“ مزدار نے کہا۔

”چھوڑو یار! خواہ خواہ موڈ نہ خراب کرو۔ میں بھی اتنا سمجھتا ہوں۔“ آصف نے برا سامنہ بنا

کر کہا۔

”میں صرف اتنا ہی چاہتا ہوں کہ ہوشیار رہنا۔ کہیں سارے ہی سینئر آفیسروں کی بے عزتی

نہ کرا بیٹھو۔“

”یار بس ختم۔“ آصف جھلا گیا۔ ”ویسے اگر میرا یہاں بیٹھنا گراں گزر رہا ہو تو اٹھ جاؤں۔“

”ارے نہیں.... ارے نہیں....!“ سمجھوں نے بیک وقت کہا۔ مگر آصف کا موڈ خراب

ہو چکا تھا۔

وہ لوگ چائے پیتے رہے۔ لیکن پھر کسی نے اس مسئلے کو نہیں جھپٹا! دوسری صبح کیپٹن حمید

ریلوے اسٹیشن پر آصف کا منتظر تھا۔ آصف آیا اور حمید سے معمولی اور رسمی گفتگو کے بعد ٹرین کا

انتظار کرنے لگا۔

حمید اس کی حماقت آمیز سنجیدگی پر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آصف خواہ خواہ

بن رہا ہے۔ زبردستی خود پر آفسرانہ رعب دلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کی شکل اس وقت

حمید کو بڑی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ مگر وہ خاموش ہی رہا۔ اس طرح دم دبائے اُس کے پیچھے پھرتا

رہا جیسے یہ وقتی ماتحتی کی بجائے پشتینی غلامی ہو۔

اچانک اُسے قاسم دکھائی دیا جس کے ساتھ سامان بھی تھا اور اب حمید کو اپنی غلطی کا احساس

ہوا.... بات یہ تھی کہ ٹیکم گڈھ جانے کا یہ سرکاری پروگرام اچانک بنا تھا اور اُس نے حمید کے نجی

پروگراموں پر خاک ڈال دی تھی۔ آج کے لئے قاسم سے وعدہ تھا کہ دونوں ایگل بیچ جائیں گے

اور دو دن وہاں گرین ہٹ میں گزاریں گے۔ لیکن پچھلی ہی شام اُسے قاسم کو فون پر اطلاع دینی

پڑی کہ وہ ایگل بیچنے جا سکے گا۔ قاسم نے وجہ پوچھی تو غیر ارادی طور پر زبان سے نکل گیا کہ ایک

سرکاری کام سے ٹیکم گڈھ جانا ہے۔ ادھر قاسم کا ایمان تھا کہ اگر دنیا ہی میں جنت کے ”بچے“

لوٹنے ہوں تو ”حمید بھائی“ کے ساتھ سفر کرو۔ لہذا یہ معلوم کر کے کہ حمید ٹیکم گڈھ جانے والا

ہے اس کی کھوپڑی کی برف کا پھلنا ضروری تھا۔

حمید نے اُسے دیکھا اور ٹھٹک گیا۔ آصف تو ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ اس کی شان کے خلاف تھا

کہ حمید کو رکتے دیکھ کر وہ بھی رک جاتا۔ وہ پلیٹ فارم کے دوسرے سرے کی طرف جا رہا تھا۔

”پچھا نہیں چھوڑوں گا پیارے۔“ قاسم انگلی اٹھا کر ہنسا۔ ”یا ایگل بیچ یا ٹیکم گڈھ۔“

”میں سرکاری کام سے جا رہا ہوں....“ حمید کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔

”میں غیر سرکاری کام سے جا رہا ہوں.... ہی ہی ہی۔“

”تم میرے ساتھ نہیں رہ سکو گے۔“

”اماں.... کیا میں تمہاری گود میں بیٹھا جا رہا ہوں۔“ قاسم ہاتھ نچا کر بولا۔

”کچھ بھی ہو! تم مجھ سے دور ہی رہو گے۔“

”کتنے میل کے فاصلے پر....!“ قاسم نے احمقانہ انداز میں پوچھا۔

”بیکار باتیں نہ کرو۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کے خلاف نہ کرنا۔“

”اماں قبو جلدی سے۔“

”کسی دوسرے کپار ٹمنٹ میں بیٹھنا تو نہ میرے ساتھی کو اعتراض ہو گا۔“

”اے جاؤ کرئل صاحب تم سے زیادہ خیال کرتے ہیں میرا۔“

”ساتھی سے مراد کرئل نہیں ہیں۔“

”پھر قون سالا ہے۔“

”ایک دوسرا آفیسر....!“

”مجھے اُلونہ بناؤ.... پیارے.... میں سب سمجھتا ہوں۔“ قاسم آنکھ مارنے کی کوشش کرتا ہوا مسکرایا اور اس کی شکل بے حد مضحکہ خیز ہو گئی۔

”میری بات سنو۔“

”سناؤ نا۔“

”ہمارا سفر ایک ہی کمپارٹمنٹ میں نہیں ہوگا۔ ٹیکم گڈھ کی بات وہیں چل کر طے ہوگی۔“

”اے کوئی مجھے لڑکی کی شادی کرتا ہے کہ نواب صاحب بات طے کرنے بیٹھیں گے۔“

قاسم جل کر بولا۔

”میرے پاس وقت نہیں ہے۔“ اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

قاسم وہیں کھڑا طرح طرح کے منہ بناتا رہا.... حمید اسی سمت جا رہا تھا جدھر آصف گیا تھا۔ تھوڑی دیر چل کر ہی اس نے چالیا۔

”یہ کون تھا جس سے تم گفتگو کر رہے تھے۔“ آصف نے پوچھا۔

”میرا ایک دوست! کیوں کیا اس میں بھی کوئی حرج....!“

”کیپٹن حمید تم سے جو کچھ پوچھا جائے صرف اسی کا جواب دیا کرو۔“

”بہت بہتر....!“ حمید نے اظہار سعادت مندی کے سابقہ ریکارڈ توڑ دیئے۔

اس کے رویہ پر کبھی کبھی آصف متحیر بھی رہ جاتا۔

ٹرین آئی اور وہ ایک کمپارٹمنٹ میں جم گئے۔ قاسم نے بھی حمید کے مشورے سے اختلاف نہیں کیا تھا۔ کسی دوسرے ہی کمپارٹمنٹ کو ترجیح دی تھی۔

ٹرین روانہ ہو گئی.... حمید کا رویہ سعادت مند نہ ہی رہا۔ آصف بار بار اُسے گھورنے لگتا تھا۔ یہ آصف بھی عجیب ہی آدمی تھا۔ اب حمید کی سنجیدگی اُسے کھلنے لگی تھی۔ دراصل وہ فطرتاً ”تم تو مجھے چھیڑو گے!“ قسم کا آدمی سمجھا جاسکتا تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ کوئی اُسے چھیڑے اور وہ ہاتھوں میں پتھر لئے اُسے دوڑاتا پھرے۔

آخر کچھ دیر بعد جب اُسے چین نہ پڑا تو اس نے حمید کو مخاطب کیا۔

”کیوں.... تمہارا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے۔“

”بہت دیر سے پائپ نہیں پیا۔“ حمید نے مضحل آواز میں جواب دیا۔

”کیوں.... کیا تمباکو ختم ہو گیا۔“

”تمباکو ہے۔“

”پھر پیٹے کیوں نہیں۔“

”میں نے سوچا ممکن ہے آپ کو ناگوار گزرے.... بہتر ہے آفیسر اپنے ماتحتوں کی تمباکو

نوشی پسند نہیں کرتے۔“

”ارے کیا چرخہ نکال بیٹھے ہو آفیسری ماتحتی کا....“ آصف ہاتھ ہلا کر بولا۔ ”پیو....!“

”شکریہ....!“ حمید نے سعادت مند انداز میں کہہ کر پائپ نکالا اور اس میں تمباکو بھرنے لگا۔

”تم کئی بار پہلے بھی ٹیکم گڈھ جا چکے ہو۔“ آصف نے کہا۔

”کئی بار۔ بڑی پُر فضا جگہ ہے۔ آج کل تو جنت کا نمونہ بنا ہوا ہوگا۔“

”وہاں سے وادی کاغان کا جیک والی سرحدی چوکی کتنی دور ہوگی۔“

”زیادہ سے زیادہ دس میل۔ لیکن پہاڑی علاقوں کے دس میل ہزار میل معلوم ہوتے ہیں۔

مگر ہم قیام کہاں کریں گے۔“

”بھئی! میں کیا جانوں۔ میں تو پہلی بار اُس علاقے کی طرف جا رہا ہوں۔“

”مناسب یہی ہوگا کہ ہم ٹیکم گڈھ میں قیام کریں.... فزار وہاں کا سب سے زیادہ شاندار

ہوٹل ہے۔ وہیں قیام کریں گے.... آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ فیچر تو مرد طے گا ورنہ سارے

کام عورتیں انجام دیتی ہیں۔ پکانے والی عورتیں.... سرو کرنے والی عورتیں۔“

”عورتیں یالڑکیاں....!“ آصف نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

”آپ نے تو مجھے پریشانی میں مبتلا کر دیا۔“

”کیوں....؟“

”قسم لے لیجئے جو آج تک عورت اور لڑکی کا فرق میری سمجھ میں آیا ہو۔“

”بس انہیں ساری خبیثتوں کی وجہ سے تم سے دور ہی دور رہنے کو دل چاہتا ہے۔“

”اگر یہ فرق سمجھ میں نہ آئے تو اسے شیطنیت کہیں گے۔“ حمید نے بھولے پن سے پوچھا۔

”چلو ختم کرو.....!“ آصف نے براسامہ بنا کر کہا۔

شاہکار

”چھن..... چھن..... چھن.....!“

برابر والے کمرے میں گھنگھر دوں کی جھنکار گونج رہی تھی۔ جیلانی نے بہت براسامہ بنا کر دروازے کی طرف دیکھا لیکن چپ چاپ بیٹھا ہی رہا۔

”ایک دو..... تین چار..... پانچ..... چھن..... چھن..... چھن.....!“

دوسرے کمرے میں صوفیہ ناچ رہی تھی۔ ناچ کیا ہی تھی اُسے تاؤ دلارہی تھی۔ جیلانی نے کہا تھا کہ وہ آج کل سکون چاہتا ہے۔ اس کی ذہنی حالت اس قابل نہیں ہے کہ وہ کسی قسم کا بیجان برداشت کر سکے۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ اسے چھیڑتی ہی رہتی تھی۔

اس وقت بھی صرف اُسے تاؤ لانے کے لئے گھوگر دبانہ کر برابر والے کمرے میں اچھلنا کودنا شروع کر دیا تھا جیلانی تھوڑی دیر تک دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا رہا۔ پھر اٹھا اور دیوانوں کی طرح دروازہ پیٹنے لگا۔

گھوگھر دوں کی جھنکار ختم گئی۔ دروازہ جھٹکے کے ساتھ کھلا اور صوفیہ صرف ہونٹ کھول کر رہ گئی۔ اُسے جیلانی کی آنکھوں سے خوف معلوم ہو رہا تھا۔

”تم نہیں مانو گی.....!“ جیلانی غریبا۔

”بڑی مضیبت ہے۔“ اس نے خود پر قابو پا کر کہا۔ ”نیچے آنٹی جان کو آجاتی ہیں اور اوپر تم موجود ہو۔ پھر میں کہاں مشق کروں۔“

”تم مجھے پریشان کرنا چاہتی ہو۔“ جیلانی آنکھیں نکال کر بولا۔

”نہیں قسم لے لو..... میں کیا جانتی تھی کہ تمہیں میرا چنا چنا اتنا گراں گزرے گا۔ ورنہ میں کبھی ادھر نہ آتی۔“

”ہوں.....!“ جیلانی چند لمحے..... کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”آؤ..... یہاں آؤ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں..... میرا دماغ پک رہا ہے۔“

وہ چھن چھن کرتی ہوئی اس کے کمرے میں چلی آئی۔

”بیٹھ جاؤ.....!“ جیلانی نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”لو بیٹھ گئی۔“ صوفیہ بیٹھتی ہوئی مسکرائی۔

”تم مجھے کیا سمجھتی ہو۔“

”ایک مغرور مگر اناڑی مصور.....!“

”تمہارے دونوں ہی خیال لغو ہیں۔“

”یہ بھی محض خیال ہے.....!“

”میں مغرور نہیں ہوں..... میں اناڑی نہیں ہوں۔“

”اگر آدمی کو خود ہی اپنی خامیوں کا احساس ہو جائے تو وہ اُن خامیوں کو باقی ہی کیوں رہنے دے۔“

”تم نہیں سمجھ سکتیں۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔“ جیلانی نے بے بسی سے کہا۔

”کیا سمجھنا چاہتے ہو۔“ دفعتاً صوفیہ کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔ جیلانی کچھ سوچنے لگا

تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔

”کیا تمہارے ذہن میں کبھی دھماکے ہوتے ہیں۔“

”ذہن میں دھماکے..... میں نہیں سمجھی۔“

”تم دھماکے بھی نہیں سمجھتیں.....!“ جیلانی جھنجھلا گیا۔

”دھماکے تو سمجھتی ہوں لیکن ذہنی دھماکہ میرے لئے ایک بالکل نئی چیز ہے۔“

”اچھا کبھی تمہارے ذہن میں بجلی سی کوندتی ہے۔“

”جب میں حلق تک کھانا ٹھونس لیتی ہوں تو آنکھیں بند ہونے لگتیں ہیں اور ایسا محسوس

ہوتا ہے جیسے ذہن میں بجلیاں سی کوندتی پھر رہی ہوں۔“

”میرا مذاق نہ اڑاؤ۔“ جیلانی نے ناخوش گوار لہجے میں کہا۔

”خدا یا میں پچارے آرٹ کو کیسے سمجھاؤں.....!“

”بس اب جاؤ۔ میں جانتا ہوں کہ تم لوگ مجھے مکان سے نکالنا چاہتے ہو۔“

”بے تکلی باتیں نہ کرو۔“

”میری وجہ سے سب کو تکلیف ہوتی ہے۔“

”خیر یہ مسئلہ تو آنٹی کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔“
 ”ان سے کہو کہ میرا سامان سڑک پر پھینکوا دیں۔“
 ”آخر کیوں۔“

”میں شاید کچھ دنوں بعد اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھوں! پھر تکلیف دہ ہو جاؤں گا تم لوگوں کیلئے۔“
 ”لیکن ذہنی توازن کیوں کھو بیٹھو گے۔ آخر کسی ڈاکٹر سے مشورہ کیوں نہیں لیتے۔“
 ”وہ بھی میرا مضحکہ اڑائے گا۔ جب میں اُسے بتاؤں گا کہ میرے ذہن میں دھماکے سے ہوتے ہیں اور بجلیاں سی کوندتی ہیں۔“

”آنٹی کہہ رہی تھیں کہ تمہیں کچھ دنوں تک مکمل آرام کرنا چاہئے.....!“
 ”آرام..... نہیں مجھے صرف ذہنی سکون چاہئے۔ کوئی ایسی جگہ چاہئے جہاں ہوا کی سرسراہٹ بھی میرے کانوں سے نہ ٹکرا سکے۔ مگر تمہیں مشق کرنی ہے تمہیں حلق پھاڑنا ہے..... خیر صبح تم مجھے یہاں نہیں دیکھو گی۔ شام تک اپنا سامان لے جاؤں گا۔“
 ”یعنی صرف اس لئے جاؤ گے کہ میں.....!“

”اوہ.....!“ صوفیہ کے چہرے سے اضطحال ظاہر ہونے لگا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو اب میں تمہیں پریشان نہیں کروں گی..... مجھے افسوس ہے۔ مجھے افسوس ہے۔“
 ”وہ تھوڑی دیر تک خاموش کھڑی رہی پھر جانے کے لئے مڑی ہی تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی..... یہ بیگم تویر کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔“

”آجائے.....!“ جیلانی نے کہا۔

”دروازہ کھول کر مسرتویر اندر آئیں..... ان کے ہاتھ میں کوئی اخبار تھا اور وہ بے حد خوش نظر آرہی تھیں۔“

”ارے..... جیلانی تم کیسے آدمی ہو۔ یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ کچھ باہر کی بھی خبر ہے.....!“ انہوں نے صوفیہ کی طرف دھیان دیئے بغیر کہا۔

”باہر کیا ہو رہا ہے.....!“ جیلانی نے حیرت سے کہا۔

”ذرا بالکلی پر جا کر دیکھو۔“ ان کے لہجے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

”کیا دیکھوں.....!“ بیگم تویر نے اخبار اس کے سامنے پھیلا دیا۔ ایک مقامی اخبار کا ضمیمہ

تھا۔ پہلے ہی صفحے پر جلی حرفوں میں تحریر تھا۔
 ”عظیم فنکار جیلانی کو سلام“

صوفیہ بھی اخبار پر جھک پڑی تھی وہ بلند آواز میں آگے کی تحریر پڑھنے لگی۔

”بین الاقوامی مصوری کی نمائش کی شاہکار تصویر ”چرواہی“ جنوں کی مجلس کا منفرد فیصلہ.....
 چرواہی اس سال کی بہترین تصویر ہے۔ یہ فیصلہ مسٹر جیلانی کی عدم موجودگی میں سنایا گیا.....
 ہمیں اطلاع ملی ہے کہ مسٹر جیلانی اس دوران میں ایک بار بھی نیشنل آرٹ گیلری میں نہیں دیکھے گئے۔ پچھلی رات جب مختلف اقوام کے بڑے مصور گیلری میں تصاویر کا انتخاب کر رہے تھے اُس وقت بھی جیلانی صاحب اپنی تصویر کے قریب موجود نہیں تھے۔ نمائش کے پہلے ہی دن ہمارے نمائندے کو اُن سے گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا تھا..... انہوں نے اُسے بتایا تھا کہ وہ اُس مقابلے میں بہت بے دلی سے شریک ہوئے تھے۔ بس انہیں زبردستی کھینا گیا تھا۔ اپنی تصویر کے بارے میں انہوں نے خیال ظاہر کیا تھا وہ بھی یوں ہی سی ہے۔ انہوں نے اس پر خاص توجہ نہیں دی..... یہ جیلانی صاحب کی کسر نفسی تھی..... ورنہ پہلے ہی دن سے ان کی تصویر کے قریب اڑدھام نظر آتا رہا ہے..... واضح رہے کہ جیلانی صاحب نے تین سال میں صرف ہی ایک انسانی تصویر بنائی ہے۔“ صوفیہ خاموش ہو کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ وہ متحیرانہ انداز میں پلکیں چپکایا ہی تھی۔
 ”اب تم مجھے بتاؤ کہ میں لوگوں کو کہاں بٹھاؤں.....!“ بیگم تویر نے پوچھا۔
 ”کن لوگوں کو.....!“

”پریس رپورٹروں اور آئوگراف لینے والوں کا ایک جم غیر باہر موجود ہے۔“

”میرے خدا.....!“ جیلانی نے خوفزدہ آواز میں کہا۔ ”مگر میں تو بیمار ہوں۔ مجھے بھیڑ بھاڑ سے وحشت ہوتی ہے۔ خدا کے لئے انہیں کسی طرح ٹال دیجئے۔“

”میرے بس سے باہر ہے۔“ بیگم تویر اُسے متحیرانہ نظروں سے گھورتی ہوئی بولیں۔ ”میں دیکھتی ہوں کہ تم پر اس خبر کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہوا..... کیا تمہیں پہلے ہی سے معلوم تھا۔“
 ”نہیں.....!“ جیلانی کے ہونٹوں پر پھینکی سی مسکراہٹ نظر آئی۔ ”یہ فیصلہ کسی قسم کی جانبداری کا نتیجہ نہیں ہے۔“

”ارے..... یہ مطلب نہیں تھا..... میرا۔“

”بس انہیں کسی طرح ٹال دیجئے۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔۔۔!“
 بیگم تنویر کی آنکھوں میں تشویش صاف پڑھی جاسکتی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہیں پھر واپس چلی گئیں۔ صوفیہ اب بھی وہیں کھڑی تھی۔

”جاؤ۔۔۔ تم بھی بیگم صاحبہ کی مدد کرو۔“ جیلانی نے اس سے کہا۔

”تم ساری دنیا کو بوقوف بنا رہے ہو۔“ صوفیہ کا لہجہ زہریلا تھا۔

”میں نہیں سمجھا تم کیا کہنا چاہتی ہو۔“ جیلانی نے حیرت سے کہا۔

”تم اب تک ہزاروں آدمیوں سے یہی کہہ چکے ہو کہ وہ تصویر تخیلی ہے۔“

”میں جانتی ہوں کہ تمہارے سامنے کوئی ماڈل موجود نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی میں اُسے تخیلی نہیں تصور کر سکتی۔“

”مت کرو! جاؤ میرے مکان نہ کھاؤ۔ ہاں میں دنیا کو دھوکا دے رہا ہوں۔ پھر۔۔۔ میرا کیا بگڑے گا۔۔۔ اگر وہ اس سال کی شاہکار تصویر نہ قرار پاتی تو کیا ہوتا۔ کیا میں جیلانی کی بجائے گیلانی ہو جاتا۔“

”تم مغرور اور چڑچڑے ہو۔ تم میں آرٹسٹوں کی سی کوئی بات نہیں ملتی۔“

”میں لکڑہارا ہوں۔ جاؤ پور نہ کرو۔“

”میں تمہیں اتنا بور کروں گی کہ تم دیوار سے سر ٹکراتے پھر دو گے۔“

”سچ کہتا ہوں۔ تمہیں مایوسی ہوگی۔“ جیلانی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نظر آئی۔

”میں تمہاری عدم موجودگی میں اپنے ہی ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ سکتا ہوں۔ لیکن تمہیں اس سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں دے سکتا۔“

”میری ضد میں۔۔۔ کیوں؟“

”ہاں تمہاری ضد میں۔“ جیلانی کی مسکراہٹ برقرار رہی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس مسکراہٹ کے لئے اپنے ذہن سے جنگ کرنی پڑ رہی ہو۔

”آخر تمہیں مجھ سے کیوں ضد ہے؟“ صوفیہ نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تم نے پچھلے جنم میں میری مرغیاں چرا لی

ہوں۔۔۔!“ صوفیہ کو جیلانی کی سنجیدگی پر ہنسی آگئی۔

”تم تو ادواگون کے بھی قائل معلوم ہوتے ہو۔“ اس نے کچھ دیر بعد ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”کیوں نہ قائل ہوں۔ مجھے اس سے کون روک سکتا ہے۔“

”اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ تم ایسے اعتقادات رکھتے ہو تو۔۔۔!“

”آج ہی سے اس کی پبلیٹی بھی شروع کر دو۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح میں جیلانی سے گیلانی

بن جاؤں۔ لیکن نہ تو میری شکل تبدیل ہوگی اور نہ میں چھوٹا آرٹسٹ کہلاؤں گا۔“

”اور یہ سب کچھ میری ضد میں ہوگا۔۔۔ کیوں؟“ صوفیہ آنکھیں نکال کر بولی۔

”بالکل۔۔۔!“

”تو تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہارے سامنے نہ آیا کروں۔“

”ہاں میں یہی چاہتا ہوں۔ حتیٰ کہ میری خواہش تو یہ ہے کہ تمہاری آواز بھی میرے کانوں

میں نہ پڑنے پائے۔۔۔!“

”تم میری توہین کر رہے ہو۔“ صوفیہ نے جھینپے ہوئے لہجے میں کہا۔

ٹھیک اسی وقت بیگم تنویر۔۔۔ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اس بار کوئی بہت بُری خبر لائی ہو۔

ان دونوں نے استفہامیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ ابھر بیگم تنویر جیلانی کو ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھیں جیسے وہ ان کے لئے کوئی اجنبی ہو!

”کیا بات ہے آنٹی؟“ صوفیہ نے سکوت توڑا۔

”اول۔۔۔!“ بیگم تنویر اس طرح چونک پڑیں جیسے اونٹنی رہی ہوں۔ پھر انہوں نے جیلانی

سے کہا۔ ”سب لوگ جا چکے ہیں لیکن ایک آدمی اب بھی نشست کے کمرے میں موجود ہے۔“

”کون ہے؟“

”حکمہ سراغ رسانی کا ایک آفیسر کرنل فریدی۔“

”کرنل فریدی۔“ صوفیہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر وہ مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتی ہوئی بولی۔ ”اوہ آنٹی یقین نہیں آتا کہ کرنل فریدی ہمارے مکان میں۔۔۔ میں انہیں دیکھنا

چاہتی ہوں۔۔۔ مگر آنٹی اُن کا یہاں کیا کام۔۔۔!“

”یہی میں جیلانی سے پوچھنا چاہتی ہوں۔“

”میں کیا جانوں۔“ جیلانی نے متحیرانہ لہجے میں کہا۔
 ”میں نے اس سے بھی یہی کہا تھا کہ تم بیمار ہو۔ نیچے نہیں آسکتے۔ اس پر اس نے کہا کہ میں
 اُن سے بستر مرگ پر بھی چند سوالات کے جواب حاصل کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔“
 ”وہ مجھ سے کیا پوچھے گا۔“
 ”یہ تو وہی بتا سکے گا۔ یا تم جانتے ہو گے۔“ بیگم تنویر کے لہجے میں بے اعتباری تھی۔
 ”میں..... میں کیا جانوں کہ وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔ بھلا محکمہ سرانگ رسانی کے کسی
 آفیسر کو مجھ سے کیا سروکار..... خیر چلنے میں دیکھتا ہوں۔“
 ”تم جاؤ گے.....! بیگم تنویر نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔
 ”جی ہاں! اب تو جانا ہی پڑے گا۔ پتہ نہیں وہ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتا ہے۔“
 ”تم ہوش میں ہو یا نہیں۔ جیلانی..... مجھے پریشان نہ کرو۔ ارے میں اُس سے کہہ چکی ہوں
 کہ آج کل تم پر ہارٹ ایک ہو رہے ہیں اور تم بستر سے نہیں اٹھ سکتے۔“
 ”او نہہ! میں کہہ دوں گا کہ میں نے پریس رپورٹروں سے جان چھڑانے کیلئے کہلوادیا تھا۔“
 ”نہیں! تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تمہیں بستر پر لیٹنا پڑے گا اور میں اُسے یہیں لاؤں گی۔“
 ”میں پولیس والوں کو دھوکے میں رکھنا اچھا نہیں سمجھتا۔“
 ”لیکن میں سرکاری ملازم ہوں.....! بیگم تنویر پولیس۔“ پولیس سے میری غلط بیانی میرے
 لئے مضر ثابت ہو گئی۔

”اگر یہ بات ہے تو میں مردہ تک بن سکتا ہوں۔ جائے اُسے یہیں لائیے۔“
 ”مگر جیلانی بیٹے! آخر وہ تم سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔“
 ”میں کیا بتا سکتا ہوں۔ مجھے خود ہی اس پر حیرت ہے۔“
 ”دیکھو! اگر تم نے کوئی غیر قانونی حرکت کی ہے تو اس کا اثر مجھ پر بھی پڑ سکتا ہے۔“
 ”اپنی دانست میں تو میں نے آج تک کوئی غیر قانونی حرکت نہیں کی۔“

”خیر میں اُسے لارہی ہوں..... خدا میرے حال پر رحم کرے۔“
 بیگم تنویر چلی گئیں اور جیلانی بستر پر آ لیٹا۔ سینے تک چادر کھینچ لی۔

”مجھ سے بتادو۔“ صوفیہ نے آہستہ سے کہا اور جیلانی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”میں قاتل ہوں.....! اُس نے کہا۔
 ”نہیں.....؟“ صوفیہ دو چار قدم پیچھے ہٹ گئی۔
 ”یقین کرو.....!“
 ”تم جھوٹے ہو۔“ اُس نے زبردستی ہنس کر کہا۔
 ”ابھی تم دیکھ ہی لو گی..... وہ ہتھکڑیاں لگا کر مجھے یہاں سے لے جائے گا۔“
 ”خدا کے لئے بے تکی باتیں نہ کرو.....!“ وہ خوفزدہ آواز میں بولی۔
 ”کیوں تمہیں کیا۔“
 ”بحث نہ کرو..... تم جھوٹے ہو.....!“
 ”اسی لئے میرے پیر مجھے پھانسی کے تختے کی طرف لے جائیں گے۔ اتنے دنوں میں بہت بچا
 رہا۔“ جیلانی مسکرایا۔
 ”نہیں..... نہیں..... نہیں.....!“ وہ بے تحاشہ اس پر جھک پڑی اور اس کے شانے پکڑ کر
 جھنجھوڑتی ہوئی روپانسی آواز میں بولی۔ تم جھوٹے ہو..... تم جھوٹے ہو..... تم سب کچھ ہو سکتے ہو
 لیکن قاتل..... ہر گز نہیں۔“
 ”خاموش رہو۔ شاید وہ آرہا ہے.....“ جیلانی نے کہا اور خاموش ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔
 صوفیہ میز پر جا گئی..... اُس کا دل دھڑک رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ کہیں خود اسی پر دل کے
 دورے نہ پڑنے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد بیگم تنویر اور ایک ایسا آدمی کمرے میں داخل ہوئے جس کے چہرے پر کم از
 کم صوفیہ کی نظریں تو نہیں ٹھہر سکتیں تھیں۔ صرف ایک ہی بار دونوں کی نظریں غیر ارادی طور
 پر ملی تھیں اور صوفیہ کو ایسا معلوم ہوا تھا جیسے اس کا سارا جسم جھنجھٹا اٹھا ہو۔ بہت دنوں پہلے ایک
 بار اُسے ہلکا سا الیکٹرک شاک لگا تھا۔ جسم کی جو کیفیت اس وقت ہوئی تھی موجودہ چویشن نے اس
 کی یاد تازہ کر دی..... جیلانی نے اٹھنا چاہا۔

”نہیں! آپ لیٹے رہئے۔“ کرنل فریدی نے کہا اور صوفیہ کو ایسا لگا جیسے کوئی انہونی بات
 ہوئی ہو۔ فریدی کا لہجہ اس کے لئے غیر متوقع تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسے خونخوار
 آدمی کا لہجہ اتنی نرمی اور اتنی شائستگی رکھتا ہوگا۔ اس نے کرنل کے بہترے دل ہلا دینے والے

کارنامے سن رکھے تھے۔

”اپنی شاہکار تصویر پر مبارک باد قبول فرمائیے۔“ فریدی بیٹھتا ہوا بولا۔

”شکریہ..... جناب.....!“ جیلانی کی آواز میں اضمحلال تھا۔

”غالباً یہ کوئی موڈل تھا۔“ فریدی نے کہا۔

”جی نہیں! وہ سو فیصدی تخلیقی تصویر ہے۔“ جیلانی بولا۔

صوفیہ نے فریدی کی آنکھوں میں بے اعتباری کی جھلک دیکھی۔

”میں کیسے یقین کر لوں مسٹر جیلانی..... جب کہ.....!“ فریدی کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

”جب کہ.....؟“ جیلانی استفہامیہ انداز میں مسکرایا۔

”جب کہ میں اس عورت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔“ فریدی نے اخبار کی طرف اشارہ کیا۔

اس اخبار میں جیلانی کی شاہکار تصویر ”چرواہی“ کا عکس شائع ہوا تھا۔ دن بھر کی تھکی ہوئی چرواہی

زمین پر کہنی ٹیکے نیم دراز تھی۔ قریب ہی چند بھیڑیں چر رہی تھیں اور سورج دور کی دو پہاڑیوں

میں جھک رہا تھا۔ پتہ نہیں نیم باز آنکھیں اس منظر سے ہم آہنگ تھیں یا پھر آدھ کھلے ہونٹوں

سے جھانکنے والے شفاف دانتوں میں اس منظر سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت موجود تھی۔

کان میں سگریٹ

ٹیکم گڈھ کا موسم ان دنوں بہت اچھا تھا۔ پہاڑی نالے پانی اچھالتے ہوئے بہہ رہے تھے۔ خود

رو پھولوں سے چٹائیں ڈھکی ہوئی تھیں اور اُس سے بھی زیادہ اچھی بات یہ تھی کہ اس بار حمید کو

فزارو میں قریب قریب سبھی ملازم لڑکیاں نئی نظر آئی تھیں۔ سارا عملہ بدلا ہوا تھا۔ اس لئے اب

اس کی بھی پرواہ نہیں رہ گئی تھی کہ وہ وہاں پہچان لیا جائے گا۔ البتہ اُسے قاسم کی ذات سے خدشہ

لاحق تھا۔ وہ تو فزارو کے گاؤں کو بھی یاد ہو گا۔ اگر کسی پرانے گاہک کی نظر پڑ گئی تو خود وہ بھی

پہچان لیا جائے گا۔ اسی خیال کے تحت حمید نے قاسم کو مشورہ دیا تھا کہ وہ فزارو میں ٹھہرنے کی

بجائے کسی دوسرے ہوٹل میں ٹھہرے.....

قاسم پر چونکہ تفریح کا بھوت سوار تھا اس لئے اس نے یہی مناسب سمجھا کہ حمید کے

مشوروں پر کان دبا کر عمل کرے۔

حمید اور آصف فزارو ہی میں مقیم تھے۔ یہاں آصف کا نام رجسٹر میں سیٹھ ہاشم درج کیا گیا تھا

اور حمید اُس کے سیکریٹری کی حیثیت رکھتا تھا۔ اگر وہ ذرا سا بھی چوکے تو انہیں کسی دوسرے ہوٹل

کا رخ کرنا پڑتا کیونکہ اتفاق سے بس ایک کمرہ خالی رہ گیا تھا! ورنہ موسم بہار میں فزارو کا کوئی کمرہ

صرف ان لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جو تین یا چار ماہ پہلے ہی بکنگ کر لیتے ہیں۔ ضروری نہیں تھا کہ

ان کا قیام سیزن بھر کے لئے ہوتا لیکن پھر بھی حمید نے کمرہ پورے سیزن کے لئے بک کر لیا تھا!

اس کے لئے بھی اُسے کلرک کو رشوت دینی پڑی تھی۔

اس وقت وہ دونوں ڈائینگ ہال میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ آصف سرو کرنے والی لڑکیوں کو

گھور رہا تھا۔ دفعتاً حمید نے اپنی میز پر ویٹ کرنے والی پوریشن لڑکی سے کہا۔ ”سیٹھ صاحب کے

لئے..... وہ چاہئے۔“

”کیا جناب.....!“

”وہ جس سے دانتوں کے ریشے نکالتے ہیں۔“

”خلال جناب.....!“

”وی..... وی.....!“ حمید اُسے آنکھ مار کر مسکرایا۔

”ہوں..... ہوں.....!“ آصف بد بدایا۔ لڑکی جا چکی تھی۔

”اے تم عجیب آدمی ہو۔“ آصف آنکھیں نکال کر بولا۔

”میں نہیں سمجھا۔“

”تم نے اسے آنکھ ماری تھی.....!“

”ہاں کچھ کچھ یاد تو پڑتا ہے.....!“ حمید کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”یہ فرض شاید میں نے آپ کے

لئے انجام دیا تھا۔“

”کیا مطلب.....!“

”میں نہیں چاہتا کہ یہ لوگ ہمیں بد دماغ سمجھیں۔“

”کیا بات ہوئی۔“

”یہاں اسی طرح اپنائیت اور بے تکلفی کا اظہار کیا جاتا ہے..... یہاں کی ملازم لڑکیوں کا

کیریز ہی اسی طرح بنتا ہے۔ جس لڑکی کو جتنی زیادہ آنکھیں ماری جاتی ہیں وہ اتنی ہی مقبول سمجھی جاتی ہے اور فیجر اُس کا خاص طور سے خیال رکھتا ہے۔
”بلکواس ہے۔“ آصف ہنستا ہوا بولا۔

”ملاقات ہونے پر کرمل سے پوچھ لیجئے گا.... جب ہم پہلے پہل یہاں آئے تھے تو بیچارے کو بڑی دشواریاں پیش آئی تھیں۔ روز صبح اٹھ کر مجھ سے پوچھتے تھے کہ آنکھ مارنے کی شروعات کس لڑکی سے کریں....! رات بھر انہیں فکر رہتی تھی کہ کسی لڑکی کو شکایت کا موقع نہ مل سکے۔“
”بے ٹکی ہی ہانکتے جاؤ گے۔ تم فریدی کو بھی نہیں چھوڑتے۔“

اتنے میں لڑکی خلال لے آئی۔ حمید پھر اُسے آنکھ مار کر بولا۔ ”آج موسم بڑا خوشگوار ہے۔“
”مگر مجھے افسوس ہے جناب۔“ وہ مسکرائی۔ ”آپ تنہا ہیں۔“
”تنہا کیوں....!“ حمید نے حیرت سے کہا۔ ”سینٹھ صاحب بھی تو ہیں۔“

”اچھا....!“ وہ کھٹکھٹاتی ہوئی ہنسی کے ساتھ رخصت ہو گئی۔
”تم بہت بے باک ہو۔“ آصف مسکرا کر بولا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تم لڑکیوں کے ہاتھ سے پٹے بھی ہو گے۔“

”کئی بار....!“ حمید نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”شرم نہیں آتی....!“

”اگر کسی مونچھ والے کے ہاتھوں پٹا ہو تو ضرور آتی۔“

آصف کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دفعتاً ٹیکروفون سے آواز آئی۔

”خواتین و حضرات! آپ کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ سینٹل گھائی کی طرف نہ جائیے۔ حالانکہ وہ ایک پُر فضا جگہ ہے.... اکثر سیاح وہاں کے غاروں میں کئی کئی دن گزارتے ہیں.... لیکن آج کل گھائی مخدوش ہو گئی ہے.... پہلا موقع ہے جب موسم بہار میں وہاں تین لاشیں ملی ہیں۔ یہ غیر ملکی سیاحوں کی لاشیں ہیں جنہیں شاید لوٹا گیا تھا۔ آپ کو بار بار آگاہ کیا جا رہا ہے کہ سینٹل گھائی میں قدم نہ رکھئے۔“

حمید اور آصف متحیرانہ انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مائیکروفون خاموش ہو گیا۔

”سینٹل گھائی کہاں ہے....!“ آصف نے پوچھا۔

”یہ وہی گھائی ہے جہاں کبھی برف کے بھوت دیکھے گئے تھے۔“ حمید نے جواب دیا۔ ”اور شاید وادی کا جیک کاراستہ بھی اُدھر ہی سے گزرتا ہے۔“
”وہاں تین لاشیں۔“

”پرواہ نہ کیجئے۔ ہمارا اور لاشوں کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے تین ہوں یا تین ہزار کیا فرق پڑتا ہے۔“
”پھر وادی کا جیک کی طرف ہماری روادنگی کب ہوگی۔“

”تین دن تو تھکن اتارنے ہی میں گزر جائیں گے۔ کیا خیال ہے۔“ حمید نے پاپ سلگاتے ہوئے کہا۔ ”اوہ دیکھئے.... وہ لڑکی بہت غور سے آپ کی طرف دیکھ رہی ہے.... ماریئے آنکھ.... ماریئے۔“

”لا حول ولا قوۃ.... کیا بے ٹکی باتیں کرتے ہو۔“ آصف نے جھپنی ہوئی ہنسی کے ساتھ کہا ویسے تو وہ تنکھیںوں سے اس لڑکی کی طرف دیکھے ہی جا رہا تھا۔ جس کے متعلق حمید نے اُسے نیک مشورہ دیا تھا۔ یہ بھی فزارو کی ایک ویڈیو تھی.... یہ خوش شکل بھی تھی اور شوخ بھی معلوم ہوتی تھی۔ دفعتاً حمید نے اُسے بھی آنکھ ماری۔ پہلے تو اُس نے بُرا سامنہ بنایا پھر تیر کی طرح اُن کی طرف آئی۔

”فرمائیے....!“ اُس نے قریب پہنچ کر تیز لہجے میں کہا۔

”سینٹھ صاحب سے پوچھو۔“ حمید نے آصف کی طرف اشارہ کر کے اردو میں کہا کیونکہ یہ لڑکی ویسی ہی تھی۔

”فرمائیے جناب....!“

”مم.... مم.... میں....!“ آصف ہکلا یا.... پھر وہ حمید پر اکھڑ گیا۔ ”تم گدھے ہو بالکل.... کیا لغویت پھیلائی ہے۔“

حمید اسکی پرواہ کئے بغیر بولا۔ ”میں یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ سینٹل گھائی یہاں سے کتنی دور ہے۔!“
”ڈائریکٹری میں دیکھ لیجئے۔ فزارو اپنی الگ ڈائریکٹری رکھتا ہے۔“ اُس نے کہا اور بڑی شان سے دوسری طرف مڑ گئی۔

”گردیا نا آخر ذلیل....!“ آصف غصے سے کانپتا ہوا بولا۔ ”میں تو پہلے ہی سمجھا تھا کہ تم

دونوں نے میرے خلاف کوئی سازش کی ہے۔“

”ارے....!“ حمید نے متحیرانہ انداز میں کہا۔ ”میں نے آپ کے لئے آنکھ ماری تھی۔“

آصف جھلاہٹ میں اٹھ کھڑا ہوا.... وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ پھر بھلا حمید کیسے بیٹھا رہتا۔ وہ بھی اُس کے پیچھے لپکا اور کمرے تک پہنچنے سے پہلے ہی اُسے جالیا۔

”میں تم سے تحریری طور پر جواب طلب کروں گا۔“ وہ ہانپتا ہوا بولا۔ وہ دونوں دہیں رک گئے تھے۔ کمرہ بھی نزدیک ہی تھا لیکن غصے کی زیادتی نے آصف کو اس طرح کھوپڑی سے باہر کر دیا تھا کہ اس نے وہیں برسا شروع کر دیا۔

”دیکھئے سنئے تو سہی! میں آپ کو ہر معاملے میں اسسٹ کرنے کا تہیہ کر چکا ہوں۔ جو کام آپ سے نہیں بنے گا آپ کے لئے میں کروں گا.... بات دراصل یہ ہے کہ.... میں۔“

”لوٹوئے پن کی باتیں نہ کرو۔“

”اچھا خیر اب اس بار معاف کر دیجئے۔“ حمید نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ”مجھے اب اس کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہ ہوگی کہ آپ کو آنکھ مارنا آتا ہے یا نہیں.... چلئے کمرے میں ورنہ آپ یہاں مجمع اکٹھا کر لیں گے۔“

آصف دانت پیٹتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

کمرے میں پہنچ کر حمید نے دروازہ کھلا ہی رہنے دیا تھا۔

”اس بیہودگی کا جواب نہیں ہو سکتا۔“ آصف میز پر گھونسا مار کر بولا۔ ”تم نے میرے لئے آنکھ ماری تھی۔“

”یقیناً جناب۔ میں یہ سمجھا تھا کہ آپ کو آنکھ مارنا نہیں آتا۔“

”مجھے آنکھ مارنا نہیں آتا۔“

”انہونی بات نہیں ہے۔ شاید آپ کو وہ دیوڑیا یاد ہو جو روانگی کے وقت اسٹیشن پر ملا تھا۔ یاد ہے نا۔ اُسے بھی آنکھ مارنا نہیں آتا.... کوشش کرتا ہے تو دونوں آنکھیں بند ہوجاتی ہیں۔“

”تم مجھے احمق کیوں سمجھتے ہو۔“ آصف دہاڑا۔

”ہر اسسٹنٹ کا فرض ہے کہ وہ اپنے آفیسر کو احمق سمجھے۔ اگر ایسا نہ ہو تو آفیسر ایک دن بھی زندہ نہ رہ سکیں احمق ہی سمجھ کر اسسٹنٹ اپنے آفیسر کے کاموں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اگر

نہ رکھیں تو آفیسر دو ہی دن میں نالائق قرار دے کر نکال دیئے جائیں۔“

”تم براہ راست میری توہین کر رہے ہو۔“

”میں ایک عام بات کہہ رہا ہوں۔ جو مجھے نہ کہنی چاہئے۔ میں معافی چاہتا ہوں جناب۔“

آصف جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہی لڑکی دندناتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی جسے کچھ دیر پہلے حمید نے بقول خود ”آصف کے لئے آنکھ ماری تھی۔“

”آپ لوگوں نے سمجھا کیا ہے آخر....!“ وہ انہیں گھورتی ہوئی تیز لہجے میں بولی۔ ”وہاں میں کچھ نہیں بولی تھی۔“

”میں سمجھتا تھا کہ تم بولنے کے لئے کوئی مناسب مقام منتخب کرو گی....!“ حمید مسکرایا۔

”میں مذاقا بھی اسے برداشت نہیں کر سکتی۔“

”یہ لڑکا نادان ہے.... آپ اسے معاف کر دیجئے۔“ آصف گڑگڑایا۔

”میں صرف اپنی خدمات بخشتی ہوں۔ عزت کا سودا نہیں کرتی۔ سمجھے۔“ لڑکی آپے سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔

”سمجھ گیا....!“ حمید نے سر ہلا کر کہا۔ ”اور کچھ۔“

”میں اس کا بدلہ ضرور لوں گی خواہ موجودہ ملازمت رہے یا جائے....!“

”تم پچھلے سال تو یہاں نہیں تھیں۔“

”یہاں ہر سیزن کی شروعات پر ہی پرانا اسٹاف بدل دیا جاتا ہے۔ یہاں کچھ بھی ہوتا ہو مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ لیکن میں ان آوارہ لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو ایسی ذلیل حرکتیں کرنے والوں کی ہمت افزائی کرتی ہیں۔ میں آپ سے سمجھ لوں گی۔“ لڑکی نے ایک بار پھر انہیں کڑی نظروں سے دیکھا اور باہر چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد آصف دروازے کے قریب آکر باہر جھانکنے لگا۔ پھر بڑی احتیاط سے دروازہ بند کر کے حمید کی طرف پلٹ آیا۔

”سن لیا تم نے.... اب دیکھو کسی بے عزتی ہوتی ہے۔“ وہ آنکھیں نکال کر بولا۔

”دس پانچ جوتوں میں عزت نہیں جاتی۔ ہزار بارہ سوار نے کون آتا ہے۔“ حمید نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا۔

”تم جیسے بے حیاؤں سے خدا سمجھے۔“

حمید کچھ سوچنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر وہ بول پڑا۔ ”واقعی مجھ سے زبردست غلطی ہوئی ہے۔ ٹھہریے میں جا کر اُسے منانا ہوں۔ ورنہ اگر کہیں اس کا کوئی عاشق وادش چڑھ دوڑا تو ہم اس غریب الوطنی میں قیموں کی طرح بلبلاتے پھریں گے۔“

آصف کچھ نہ بولا۔ حمید کمرے سے نکل کر ڈائنگ ہال کی طرف ہولیا تھا۔

ہال میں اب زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ بہتری میزیں خالی نظر آرہی تھیں۔ وہ لڑکی بھی اُسے جلد ہی نظر آگئی۔ حمید اس کی طرف بڑھا۔

”کیا تم مجھے تھوڑا سا وقت دو گی۔“ حمید نے آہستہ سے پوچھا۔

”میں کہتی ہوں.... آپ ہوش میں ہیں یا نہیں۔“ وہ چڑھ کر بولی۔

”میرے دل میں پہلے بھی بدی نہیں تھی اور اب بھی میں اُس سے پاک ہی ہوں۔“

”پھر کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔“

”وجہ ہے.... لیکن اُس میں بھی تمہارا ہی فائدہ مد نظر ہے۔ کیا تم تھوڑی دیر کے لئے باہر نہیں چل سکتیں۔“

”ضرور چلوں گی۔ تاکہ آپ یہ بھی دیکھ لیں کہ میں کوئی ڈرپوک لڑکی نہیں ہوں۔ میں

منٹ انتظار کیجئے۔“

حمید اُس کے فرصت پانے کا منتظر رہا۔ پھر اکیسواں منٹ ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ وہ اس کے پاس پہنچ کر بولی۔ ”چلئے کہاں چلتے ہیں۔“

”صرف باغ تک.... اوہو آج تو یہاں زندگی رقص کر رہی ہے۔“ حمید نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”آپ نے ہمیں سے شاعری شروع کر دی۔“

”تم غلط سمجھی ہو۔ میں عشق کرنے کے لئے نہیں لے جا رہا تمہیں....!“

”چلئے بھی.... میں بہت عدیم الفرصت رہتی ہوں۔“

وہ دونوں باہر نکل آئے۔

”کہئے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ....!“

”تمہارے لئے ایک بزنس ہے۔!“

”بزنس.... نہایت آسان۔ ویسے تم مجھے شریف لڑکی معلوم ہوتی ہو۔ اس لئے میرا اندازہ ہے کہ تم صرف بزنس ہی کر سکو گی۔“

”میں نہیں سمجھ سکتی کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”میرا سیٹھ بڑا کنجوس ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ کوئی اس سے فضول خرچی نہیں کر سکتا۔“

”ہوں تو پھر....!“

”وہ کہتا ہے کہ مجھ پر عورت کا جادو نہیں چل سکتا۔“

”پھر میں کیا کروں۔“

”اُسے دکھا دو....!“

”نہیں! مجھے ان چیزوں سے دلچسپی نہیں ہے۔ میں محنت سے اپنی روزی کمانا چاہتی ہوں۔ غلط طریقوں سے حاصل کی ہوئی دولت مجھے کانٹوں کی سیج معلوم ہو گی۔“

”تمہارا نام کیا ہے....!“

”زیبا....!“

”میں ساجد ہوں.... تو تم یہ کام نہیں کر سکو گی۔“

”کیوں کروں....؟“

”تجربے کے طور پر اپنی پاکبازی کے امتحان کے لئے مجبور یوں کے عالم میں بھی اپنے ہی طور پر زندگی بسر کرنا بڑا مشکل کام ہے.... اگر اس کی بھی مشق ہوتی رہے تو کیا ہرج ہے۔ ویسے میں

اس کا ذمہ لیتا ہوں کہ تمہارا بال بھی بیکانہ ہو گا۔“

”بس سیٹھ سے گھل مل جاؤ....!“

”دیکھئے یہاں اور بھی لڑکیاں ہیں جن کا پیشہ بھی یہی ہے۔ وہ فرصت کے اوقات میں نجی طور پر مسافروں کے ساتھ رہتی ہیں۔ ہوٹل کے ذمہ داروں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔“

”اُن سے مقصد نہیں حل ہو سکتا۔“ حمید سر ہلا کر بولا۔ ”سیٹھ اُن پر روپیہ خرچ کرے گا اور

اُسے اس کا بدل بھی ملتا رہے گا.... میں تو یہ چاہتا ہوں کہ وہ روپیہ بھی خرچ کرے اور غم بھی

کرے۔ اس کے لئے کوئی شریف اور چالاک ہی لڑکی یہ کام کر سکے گی۔“

وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہی پھر کچھ کہے بغیر جانے کے لئے مڑ گئی۔ ”ٹھہرو! سنو۔“
حمید نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔
وہ پھر رک گئی۔

”یہ سٹیل گھائی میں لاشیں کب ملی ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”تین دن پہلے کی بات ہے۔۔۔!“

”کس کی تھیں۔۔۔!“

”یہ نہیں معلوم ہونگا کیونکہ اُن کے چہرے بگاڑ دیئے گئے تھے۔“

”لباس۔۔۔!“

”ان کے جسموں پر ایک تار بھی نہیں تھا۔“

”اس کا کیا مطلب تھا کہ موسم بہار میں وہاں پہلی بار لاشیں ملی ہیں۔“

”سردیوں میں تو اکثر شکاریوں کی لاشیں ملتی رہتی ہیں۔ یہ سمور کے شکار کے لئے یہاں آتے ہیں اور اکثر آپس میں لڑ جاتے ہیں۔ زخمی ہوتے ہیں مارتے ہیں۔۔۔ اور ان کی لاشیں برف میں دب رہ جاتی ہیں۔“

پھر جب برف پگھلتی ہے تب کہیں جا کر پتہ چلتا ہے کہ کچھ ہوا تھا۔ لیکن اس بار اس موسم میں وہاں تین لاشوں کا پلایا جانا بالکل ہی نئی بات ہے۔

”سٹیل گھائی میں ہے کیا! وہاں لوگ کیوں جاتے ہیں۔“

”موسم بہار میں بڑی پر فضا جگہ ہوتی ہے۔ وہاں قدیم زمانوں کے غار ہیں جنہیں آدمیوں نے بنایا تھا۔“

”تو تم اس بزنس کے لئے تیار ہو یا نہیں۔“

”سوچوں گی۔“ لڑکی نے کہا اور مڑ گئی۔ حمید اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ لڑکی خوبصورت بھی تھی اور اسماٹ بھی، تعلیم یافتہ بھی معلوم ہوتی تھی۔ کچھ بھی نہ رہی ہو لیکن اتنی صلاحیت تو ضرور رکھتی ہوگی کہ حمید کی اسکیم کے مطابق آصف کو پینڈل کر سکے۔

حمید چند لمحوں میں کھڑا رہا پھر ڈائینگ ہال کی طرف بڑھ گیا۔ لڑکی ہال میں موجود نہیں تھی۔ لیکن دفعتاً آصف آکر آیا۔۔۔ اس کے چہرے سے بدحواسی ظاہر ہو رہی تھی۔

”چلو۔۔۔۔۔ چلو۔۔۔۔۔ کمرے میں چلو۔۔۔۔۔!“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک جانب کھینچتا ہوا بولا۔

حمید کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُسے کس طرح بریک لگائے کیونکہ اُس نے تو اس کا ہاتھ پکڑ کر باقاعدہ طور پر دوڑنا شروع کر دیا تھا۔

”ارے۔۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔۔ سنئے تو سہی۔“ حمید بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ اسے احساس تھا کہ آس پاس والے انہیں حیرت سے دیکھ رہے ہوں گے۔

آصف نے کمرے ہی میں پہنچ کر دم لیا۔ ویسے دم تو اکھڑا ہوا تھا۔ سانسوں کی تیزی نے شاید حلق بند کر دیا تھا۔ بڑی دیر میں آواز نکل سکی۔

”یہ۔۔۔۔۔ کک۔۔۔۔۔ کمرہ۔۔۔۔۔!“ وہ ہانپتا ہوا بولا۔ ”آسیب زدہ ہے۔“

”کیوں۔۔۔۔۔!“

”میں بھی کچھ دیر پہلے میں کان سے سگریٹ پینے کی کوشش کر رہا تھا۔“ آصف نے خوفزدہ لہجے میں کہا اور حمید بے ساختہ ہنسل پڑا۔ لیکن آصف کا چہرہ اتنا زرد تھا جیسے وہ یرقان کے کسی بہت پرانے مریض کا چہرہ ہو۔

تصویر کی قیمت

فون کی گھنٹی بجی اور فریدی نے ریسیور اٹھا لیا۔

”لیس۔۔۔۔۔!“

”یہاں حالات دوسرے ہیں جناب۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”تفصیل۔۔۔۔۔!“ فریدی نے خشک لہجے میں کہا۔

”تصویر کے بہت سے گاہک پیدا ہو گئے ہیں۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”اس لئے اب یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ تصویر کو نیلام کیا جائے۔۔۔۔۔!“

”ہوں۔۔۔۔۔! اندازاً کتنے گاہک ہوں گے۔“

”دس گیارہ سے تو کسی طرح کم نہ ہوں گے۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”کیا اس وقت جیانی گیلری میں موجود ہے۔“

”جی نہیں! حالانکہ زیادہ تر لوگ اُسے ہی دیکھنے آئے ہیں۔“

”خیر..... ہاں تو..... اگر نیلام شروع ہو چکا ہو تو تم بھی وہیں پہنچ جاؤ اور نہایت اطمینان سے بولیاں بڑھانا شروع کر دو۔“

”بولیاں بڑھانا شروع کر دوں۔“ دوسرے نے تحیر زدہ سی آواز میں پوچھا۔

”ہاں..... بس تم اتنا بڑھ جاؤ کہ یا تو بولی ہی ختم ہو جائے یا نئے سرے سے شروع کی جائے۔“

”بہت بہتر جناب۔“

”اس شخص پر نظر رکھو جو تمہارے مقابلے پر جم جائے..... پھر جب کچھ دیر دیکھ لو کہ اب

اُس آدمی کے علاوہ اور کوئی بولی نہیں بڑھا رہا تو ایک بار خاموش ہی ہو جاؤ۔“

”یعنی اس کی بولی ختم ہو جانے دوں۔“

”قطعی طور پر اور پھر مجھے اُس آدمی کا نام اور پتہ بتاؤ جس نے آخری بولی پر تصویر خریدی ہو!“

”بہت بہتر جناب۔“

فریدی نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اب وہ پھر سامنے پھیلے ہوئے کاغذات میں کھو گیا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد پھر فون کی گھنٹی بجی۔

”ہیلو.....!“

”بولی ختم ہو گئی۔ آخری بولی اکیس ہزار تھی۔ آپ کے فرمانے کے مطابق صرف ایک ہی

آدمی اڑ گیا تھا۔“

”کون تھا۔“

”کوئی کرل وارڈ ہے.....!“

”یور پین.....؟“ فریدی نے پوچھا۔

”یور شیٹن جناب۔“ جواب ملا۔

”پتہ.....!“

”اکیاسی..... گرین اسٹریٹ۔“

”عمارت کرائے کی ہے..... یا ذاتی۔“

”تفصیلات کا علم ہوتے ہی میں آپ کو آگاہ کروں گا۔“

فریدی نے سلسلہ منقطع کر کے کسی کے نمبر ڈائیل کئے اور ماؤتھ پیس میں کہا۔ ”اٹ از ہارڈ اسٹون۔“

”دیکھو! معلوم کرو کہ آج لڑکی کالج گئی ہے یا نہیں۔ فوراً اطلاع دو۔ بیس منٹ کے اندر

اندر۔“ اس نے پھر ریسیور کرپڈل میں ڈال دیا اور سگار سلگانے لگا۔

وہ کسی خیال میں غرق تھا..... ایسے اوقات میں وقت کا اندازہ کرنا اس کے بس سے باہر

ہو جاتا تھا۔ استغراق کا خاتمہ قدموں کی آہٹ پر ہوا..... آنے والی لیڈی انسپکٹر دیکھا تھی۔

”کیا میں مغل ہوئی ہوں۔“ اُس نے فریدی کو چوکتے دیکھ کر پوچھا۔

”نہیں تو..... آؤ.....!“ فریدی نے خوش اخلاقی ظاہر کی۔ ویسے اُس کی آمد اس وقت اُسے

گراں ضرور گزری تھی۔

”یہ جیلانی کی تصویر کا کیا قصہ ہے۔“ دیکھا سامنے والی کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

”کیوں.....؟ تمہیں کیسے علم ہوا۔“

”بس ہو گیا۔“ دیکھا مسکرائی۔ ”مجھے اطلاع ملی تھی کہ آپ اُس تصویر میں بہت زیادہ دلچسپی

لے رہے ہیں اور جیلانی کے گھر پر بھی گئے تھے۔“

”وہ فن کا ایک بہترین نمونہ ہے۔“ فریدی مسکرایا۔

”اور جیلانی کے لئے ایک آسب۔“ دیکھا بھی مسکرائی۔ ”لیکن وہ بیچارہ اُس وقت سے بہت

زیادہ پریشان ہے جب سے آپ نے اُسے اپنی ایک شناساکی تصویر ظاہر کیا ہے۔“

”تمہیں یہ سب کچھ معلوم کیسے ہوا۔“ فریدی جھنجھلا گیا۔ ”کیا تم نے ان لوگوں سے پوچھ گچھ

کی تھی۔“

”نہیں میں نے کوشش نہیں کی تھی بس کسی طرح معلوم ہو گیا۔“

فریدی نے پھر کچھ نہیں پوچھا۔ لیکن دیکھا تھوڑی دیر بعد بولی۔ ”اور ابھی کچھ دیر پہلے آپ

کے آدمی تصویر کے نیلام میں بولیاں بڑھا رہے تھے۔“

”اپنے کام سے کام رکھا کرو۔“ فریدی نے ناخوشگوار لہجے میں کہا اور ایک رجسٹر کے اوراق

اٹھنے لگا۔ جس کا مطلب یہی تھا کہ اب وہ اس مسئلے پر مزید گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔

”کیا آپ خفا ہو گئے۔“ ریکھانے کہا۔

”ضروری نہیں کہ تمہارے سارے سوالات کے جواب دیئے جائیں۔“

”بس دیکھئے مجھے یہ ساری باتیں اتفاقیہ طور پر معلوم ہو گئی ہیں۔ میں نے کوشش نہیں کی تھی۔“

”اب ایسے اتفاقات بھی نہ ہونے چاہئیں۔ ورنہ نتیجے کی تم خود ذمہ دار ہو گے۔“

”اوہ.... آپ سچ خفا ہو گئے ہیں۔“

فریدی نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی اور دوسرے ہی لمحہ میں اردلی اندر آیا۔

کرٹل نے اس کی طرف ایک فائیل بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اس میں کچھ ایسے کاغذات بھی ہیں

جن کے اوپر صرف ”پی“ لکھا ہوا ہے.... انہیں چھانٹ کر الگ کر ڈالو.... یہیں بیٹھ جاؤ۔“

فریدی نے ریمش کی خالی ڈسک کی طرف اشارہ کیا۔

”اچھا اب مجھے اجازت دیجئے۔“ ریکھانے جھینپے ہوئے لہجے میں کہا اور اٹھ گئی۔ نہ فریدی نے

رسمائی اُسے روکنے کے لئے کچھ کہا اور نہ اپنے چہرے سے یہی کچھ ظاہر ہونے دیا کہ اس نے ریکھا

کی گفتگو سے کوئی اثر لیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔ اس بار کسی لڑکی کے متعلق خبر آئی تھی کہ وہ کالج میں

موجود ہے۔ فریدی نے سلسلہ منقطع کر کے گھڑی پر نظر ڈالی اور پھر اس اردلی کی طرف دیکھنے لگا

جو فائل سے کاغذات نکال رہا تھا۔

”کتنی دیر لگے گی۔“ فریدی نے اس سے پوچھا۔

”جی ہو گئے....!“ اردلی نے کاغذات سمیٹ کر اس کی میز پر رکھ دیئے اور فریدی کی

اجازت سے باہر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد فریدی لان پر تھا۔ شیڈ سے اس نے لنکن نکالی اور کمپاؤنڈ سے باہر نکل کر تقریباً

دس منٹ گزر جانے پر اُس نے دوبارہ انجن اسٹارٹ کیا.... گھڑی پونے چار بج رہی تھی۔

کچھ دیر بعد اس نے کار پھر روکی اور سامنے والی عمارت کے بورڈ پر نظر جمادی جس پر

”گورنمنٹ گرلز کالج“ تحریر تھا۔

وہ اس انداز میں دوسری جانب والی دوکان کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے وہاں جانے والے کسی

آدمی کا منتظر ہو۔

کالج میں ابھی ابھی چھٹی کا گھنٹہ بج رہا تھا اور طالبات غول در غول پھاٹک سے برآمد ہو رہی

تھیں۔ فریدی نے عقب نما آئینے کی پوزیشن تبدیل کر دی تھی اور پیچھے کی جانب مڑے بغیر ہی

انہیں بخوبی دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے بیگم تنویر کی بھتیجی صوفیہ نظر آئی اور وہ مشین اسٹارٹ

کر کے گاڑی کو آگے بڑھالے گیا۔

کچھ فاصلے پر ایک گلی میں لنکن مڑ گئی۔ گلی مختصر سی تھی۔ اس کے آخری سرے پر چھتم روڈ

کا بورڈ نصب تھا.... اُس نے دائیں جانب گاڑی موڑ لی۔ رفتار بہت معمولی تھی۔ بالکل ایسا ہی لگ

رہا تھا جیسے وہ رفتار ست کر کے دو روہ دکانوں کے سائین بورڈ پڑھ رہا ہو اُسے کسی مخصوص

دوکان کی تلاش ہو۔

فریدی کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ صوفیہ اُسے چھتم روڈ کے ایک بس اسٹاپ ہی پر ملی۔ وہ تنہا

تھی اور اپنی روٹ کی بس کا انتظار کر رہی تھی۔

فریدی نے کار اُس کے قریب ہی روک دی اور کھڑکی سے سر نکال کر بولا۔ ”اوہ.... میں تو

آپ کے گھر ہی جا رہا تھا۔“

صوفیہ بوکھلا گئی۔ اس کے ہونٹوں کے گوشے پھڑکنے لگے اور اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس

میں کوئی کی رہ گئی ہو۔ اس کے چہرے میں کوئی ایسی مضحکہ خیز تبدیلی ہوئی ہے کہ اس پاس کے

لوگ بے ساختہ ہنس پڑیں گے۔

”آئیے.... کیا حرج ہے۔“ فریدی نے پھر کہا اور صوفیہ قطعی غیر ارادی طور پر آگے بڑھ

آئی.... فریدی نے اگلی ہی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔

وہ چپ چاپ آکر بیٹھ گئی۔ اُسے شکریہ ادا کرنے تک کا ہوش نہیں تھا۔ لنکن پھر چل پڑی

لیکن اب بھی اس کی رفتار معمولی ہی تھی۔

”آپ نے سنا۔ مسٹر جیلانی کی تصویر آئیس ہزار میں فروخت ہوئی ہے۔“

”نہن.... نہیں.... میں نے نہیں سنا۔“

”اتنے خریدار ہو گئے تھے کہ تصویر کی نیلامی کروانی پڑی۔“

”اوہ....!“

”واقعی جیلانی بہت اچھے فنکار ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

صوفیہ اپنے ذہن و جسم پر کسی حد تک قابو پا چکی تھی۔

”جیلانی.... فراڈ ہے۔“ ایک بار پھر اُس کی زبان سے غیر ارادی حرکت سرزد ہو گئی۔

”فراڈ....!“ فریدی کے لہجے میں حیرت تھی۔

”اوہ.... دیکھئے....!“ صوفیہ سنبھل کر بھلائی۔ ”میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو دھوکا دیتا ہے.... اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔“

”آپ غالباً اسے جھوٹا کہنا چاہتی ہیں۔“

”جی ہاں.... جی ہاں.... یہی بات ہے۔“ صوفیہ جلدی سے بولی اور پھر اُس نے ایک طویل سانس لی جیسے اپنے بیان پر مطمئن ہو گئی ہو۔

”آپ اس کی آسیب والی کہانی پر یقین نہیں رکھتیں....!“

”کل سے پہلے مجھے یقین تھا۔“ صوفیہ کا لہجہ مغموم تھا۔ ”میں نے اُس کے بیان کی تصدیق کے لئے چھان بین کی تھی۔ ان عورتوں سے ملی تھی جن کا پتہ اس نے بتایا تھا۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”اوہ.... وہ کہتا ہے کہ آج سے تین سال پہلے اس نے کچھ عورتوں کی تصاویر بنانے کی کوشش کی تھی لیکن ان کی بجائے اسی نامعلوم عورت کی تصویر بن گئی تھی.... میں نے اُن عورتوں سے پوچھ گچھ کی تب انہیں یاد آیا کہ نمائش والی تصویر ”چرواہی“ کا چہرہ انہیں جانا پہچانا سا کیوں معلوم ہوا تھا.... انہوں نے اعتراف کیا کہ جیلانی نے ان کی تصویر کی بجائے وہی چہرہ بنا کر رکھ دیا تھا اور انہیں اُس پر بہت غصہ آیا تھا....“

”تب پھر آپ انہیں جھوٹا کیوں کہیں گی۔“

”کیا آپ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی آسیب ہے۔“

”غالباً آپ کی موجودگی ہی میں، میں نے یہ کہا تھا کہ وہ میری ایک شناسا کی بھی تصور ہو سکتی ہے۔“

”جی ہاں.... مجھے یاد ہے اور اب مجھے اس پر یقین آ گیا ہے۔“

”پہلے نہیں آیا تھا۔“

”جی نہیں۔ پہلے تو مجھے جیلانی ہی کے بیان پر یقین تھا۔“

”مگر اب آپ نے اپنی رائے کیوں بدل دی ہے۔“

”آپ کی وہ شناسا اسی شہر میں ہیں۔“ صوفیہ نے پوچھا۔ آہستہ آہستہ وہ بھولتی جا رہی تھی کہ کس محل سے یہ اس کی صرف دوسری ملاقات ہے۔

”میں نے شاید یہ بھی عرض کیا تھا کہ وہ مجھے پچھلے پانچ سال سے نہیں دکھائی دی۔“

”اوہ.... تب تو شاید آپ کو اس اطلاع پر بے حد خوشی ہو۔“

”کس اطلاع پر بے حد خوشی ہو گی۔“

”کیا آپ اپنی اس شناسا کے لاپتہ ہو جانے پر پریشان تھے؟“

”ہو سکتا ہے آپ کا اندازہ درست ہو۔“ فریدی نے ٹھنڈی سانس لے کر مغموم لہجے میں کہا۔

”تو پھر خوش ہو جائیے۔ وہ محترمہ اسی شہر میں موجود ہیں۔“

فریدی کی نظر سامنے سڑک پر تھی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”شاید آپ میری بے چینی سے محظوظ ہونا چاہتی ہیں۔“

”اوہ نہیں! یقین کیجئے کہ میں نے انہیں کل ہی دیکھا ہے۔ وہ ہمارے گھر آئی تھیں۔ مگر اس وقت نہ تو جیلانی صاحب ہی موجود تھے اور نہ آنٹی۔“

”میں کیسے یقین کر لوں۔“ فریدی نے اپنے چہرے پر ذہنی الجھنوں کے آثار پیدا کر کے کہا۔

”کیوں....؟ یقین کر لینے میں کیا دشواری ہے۔“

”بہت بڑی! اگر وہ اس شہر میں ہوتی تو سب سے پہلے مجھ سے ملتی۔“

”اب میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ ویسے وہ جیلانی پر بے حد خفا ہو رہی تھیں۔

بلکہ ان کی گفتگو کے انداز سے تو یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ جیلانی کو ذاتی طور پر نہ جانتی ہوں۔“

”کیا گفتگو ہوئی تھی۔“ فریدی نے ہنس کر پوچھا پھر سنجیدگی سے بولا۔ ”ہاں وہ ذرا تکیے مزاج کی ہے۔“

”ذرا نہیں بہت زیادہ کہئے۔ میرا خیال ہے کہ اگر جیلانی صاحب اُن کے قریب موجود ہوتے تو کم از کم انہیں اتنا تو معلوم ہی ہو جاتا کہ کسیر و پھیلنا زیادہ آسان ہے یا آدمی کی کھال اتارنا۔“

”خوب.... تو وہ اتنی ہی برا فروختہ تھی۔“

”جی ہاں....!“

”مگر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ جیلانی اس کے لئے اجنبی ہوگا۔“

”اس نے خود ہی کہا تھا کہ وہ نہیں جانتی یہ جیلانی دیلانی کون ہے اور اس نے ایسی حرکت کی ہے۔ میرے ذہن میں تو خلش موجود تھی۔ میں نے اُسے جیلانی کا فوٹو گراف دکھایا لیکن اُس نے اُسے بھی پہچاننے سے انکار کر دیا۔“

”اُس نے جیلانی کا انتظار نہیں کیا تھا۔“

”جی نہیں! وہ بہت جلدی میں تھیں اور وہ تو صرف اس آدمی کی شکل دیکھنا چاہتی تھیں جس نے انہیں اس طرح رسوا کیا تھا۔“

”آج سے پانچ سال پہلے وہ کتنی اچھی تھی۔“ فریدی ٹھنڈی سانس لے کر بڑبڑایا۔ ”اُس کے جسم پر مغربی طرز کا لباس کتنا کھلتا تھا۔“

”آہ کیا وہ اب بھی نارنجی رنگ کے سکرٹ پر سفید بلاؤز پہنتی ہے۔“

”بلاؤز..... اسکرٹ.....! صوفیہ نے حیرت سے دہرایا۔“

”ہاں..... جی ہاں۔“

”مگر کل تو وہ برقعے میں تھیں اور مجھے اُن کے لباس میں بھی کوئی جدت نہیں دکھائی دی تھی۔ البتہ اُن کی نیلی آنکھیں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔“

تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر فریدی نے کہا۔ ”جیلانی صاحب پر اس اطلاع کا کیا رد عمل ہوا تھا۔“

”رد عمل کیا ہونا تھا۔ پہلے تو اُسے میرے بیان پر یقین ہی نہیں آیا تھا۔ پھر جب میں تھوڑی دیر بعد گرم ہو گئی تو اُسے یقین پھر بھی نہیں آیا۔ وہ خواہ مخواہ مجھ سے لڑتا اور میرے بیان کی تردید کرتا رہا تھا۔ پھر بیہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ میں سمجھتی ہوں کہ جب وبحث میں شکست کھانے لگا تو اُس پر غشی طاری ہو جاتی ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ فریدی خواہ مخواہ ہنس پڑا۔

”لیکن وہ کہتا بھی ہے کہ جب بھی اس کو آسیب کے متعلق کوئی الجھن آپڑتی ہے تو اس

غشی کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔“

”یہ جیلانی صاحب پہلے کہاں رہتے تھے۔ ان کے خاندان کے دوسرے افراد کہاں مل سکتے

گے۔“ فریدی نے کچھ دیر خاموش رہ کر پوچھا۔

”اس نے یہ سب کچھ ہمیں آج تک نہیں بتایا۔“

”بڑی عجیب بات ہے۔“

”ایک بات پوچھوں۔ آپ خفا تو نہیں ہوں گے۔“

”ضرور پوچھئے.....! فریدی مسکرایا۔“

”کیا آپ صرف اسی تصویر کی وجہ سے اس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔“

”جی ہاں..... قطعی طور پر۔“ فریدی نے خشک لہجے میں کہا۔ ”لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ

نے میری استدعا کو کوئی وقعت نہیں دی تھی۔“

”جی.....! صوفیہ چونک پڑی۔ ”میں نہیں سمجھی۔“

”میں نے آپ لوگوں سے درخواست کی تھی کہ میری اس دلچسپی کا تذکرہ کسی سے نہ

کریں..... لیکن آپ نے.....!“

”میں نے تو کسی سے بھی تذکرہ نہیں کیا..... مگر نہیں ٹھہریئے..... آپ ہی کے محکمے کی

ایک عورت..... غالباً وہ انسپکٹر لیس تھیں..... انہوں نے مجھ سے اس کے متعلق پوچھا تھا۔ ہم میں

بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی تھی اور میں نے انہیں بتایا تھا کہ جیلانی اس تصویر کو آسیب کہتا ہے

اس پر انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کرئل وارڈ سے مشورہ کر لوں۔ وہ ایک ماہر روحانیت ہے۔

اکثر روحوں سے گفتگو کر دیتا ہے۔“

”تو پھر آپ کرئل وارڈ سے ملی تھیں۔“

”ارے نہیں..... مجھے کیا پڑی ہے۔“

”کیا آپ سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں کہ کل کوئی عورت جیلانی کو پوچھتی ہوئی آئی تھی۔“

”کوئی عورت نہیں بلکہ وہی عورت جس کی تصویر جیلانی نے بنائی ہے۔ یقین کیجئے۔ بھلا میں

جھوٹ کیوں بولوں گی۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ کا مکان چوراہے سے تھوڑی ہی دور ہے۔“

”جی ہاں۔“

فریدی نے کار سڑک کے کنارے لگا کر کھڑی کر دی اور آہستہ سے بولا۔ ”مجھے افسوس ہے

کہ ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ اس لئے مجھے فوراً ہی واپس جانا ہے۔ براہ کرم جیلانی صاحب کو

”کیا سنا.....!“

”کسی کی آواز..... مطلب یہ کہ کسی عورت کی آواز جس نے ابھی میری قابلیت کی تعریف کی تھی۔“

”نہیں میں نے تو کسی کی آواز نہیں سنی۔“

حمید بوکھلائے ہوئے انداز میں اپنا سر سہلانے لگا۔

”کیوں کیا تم نے کسی عورت کی آواز سنی ہے۔“ آصف نے پوچھا۔

”شاید میں نے سنی ہے.....!“

آصف کا منہ حیرت سے کھل گیا اور کچھ دیر بعد وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”وہ بھی کسی

عورت ہی کی آواز تھی جس نے مجھے کان سے سگریٹ پینے پر مجبور کیا تھا۔“

۱

”میں نہیں سمجھ سکتا کہ مجبور کیسے کیا تھا۔“

”یار سمجھنے کی کوشش کرو۔“ آصف نے زچ ہو کر کہا۔ ”فرض کرو کہ تم کسی خیال میں ڈوبے

ہوئے کان کھج رہے ہو اور اسی ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ بھی دبا ہوا ہے اچانک کسی عورت کی آواز کان میں آئے جو کہہ رہی ہو ہاں شاباش یہی ہے منہ سگریٹ لگا کر لمبا کش لو..... تو پھر حمید

صاحب سگریٹ کیا اگر ہاتھ میں ڈنڈا ہو تو بوکھلاہٹ میں وہ بھی کان ہی میں اتر جائے گا۔“

”مکی واقعہ پیش آیا تھا آپ کو.....!“ حمید نے مضطربانہ انداز میں پوچھا۔

”بالکل یہی..... اور ابھی تم نے بھی کسی عورت کی آواز سنی ہے۔“

”ہاں.....!“ حمید نے طویل سانس لی اور پھر بولا۔ ”میری زندگی بجائے خود کسی عورت کی

آواز ہے، جو ہلے ہلے مدہم سروں میں گارہی ہو..... ارے باپ رے۔“

اس بار حمید کرسی سمیت دوسری طرف الٹ گیا۔ کیونکہ کوئی عورت ہلے ہلے مدہم

سروں میں گارہی تھی۔

وہ بوکھلا کر اٹھا اور خوفزدہ آواز میں چیخا۔ ”سنا آپ نے آصف صاحب۔“

”نن..... نن تو.....!“ آصف اس سے بھی زیادہ خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔

”وہ گیت سنا رہی تھی۔“

”نہیں.....!“ آصف تھوک نکل کر ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ حمید پلکیں جھپکاتا ہوا اس

کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اچانک اس نے اُسے کسی خوفزدہ بچے کی طرح منہ پھاڑتے دیکھا۔ حلق سے ایک چیخ آزاد ہوئی اور آصف گرتا پڑتا کمرے سے بھاگا۔

”ارے.... ارے....!“ حمید نے اس کے پیچھے چھلانگ لگائی اور دونوں ہی تلے اوپر راہداری میں ڈھیر ہو گئے۔ اس بار اس نے بھی عورت کا قہقہہ سنا۔ غالباً آصف بھی سن رہا تھا اور حمید کے بچے سے نکل بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ہنو..... ہنو.....!“ وہ بُری طرح چلا۔ حمید ایک جانب لڑھک گیا اور آصف پھر اٹھ کر بھاگا۔ چوبی فرش پر اس کے قدموں کی آواز کافی تیز تھی۔

حمید بھی اٹھا مگر اب راہداری سنان پڑی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے! کچھ بھی ہو وہ اتنا بدحواس تو نہیں ہوا تھا جتنا آصف ہو گیا تھا۔

اس نے اپنا لباس درست کیا۔ ٹائی کی گرہ سنبھالی اور ڈاننگ ہال کی طرف چل پڑا۔ کمرے میں داخل ہونے کی ہمت تو اس میں بھی نہیں تھی۔

اس کی دانست میں وہ کوئی آسیبی ہی خلل تھا ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک آدمی اس نامعلوم عورت کی آواز سنتا اور دوسرا اس سے لاعلم رہتا۔

ڈاننگ ہال میں اُسے آصف نظر آیا جو ایک کرسی کی پشت سے لٹکا ہوا بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ ”پرواہ مت کیجئے۔“ حمید اس کے قریب پہنچ کر بولا۔ ”میں اس کلرک کی خبر لیتا ہوں جس نے ہم سے نذرانہ بھی وصول کر لیا تھا۔“

آصف کچھ بولا نہیں۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ حمید کاؤنٹر کی طرف مڑ گیا۔

کلرک قیام کرنے والوں کے رجسٹر پر جھکا ہوا تھا۔

”ادھر دیکھو.....!“ حمید اس کے سر پر پہنچ کر غرایا۔

”فرمائیے..... جناب.....!“ وہ چونک کر بولا۔

”تم نے مجھے اس کمرے کے متعلق بتایا کیوں نہیں تھا۔“

”میں کیوں بتاتا..... میں سمجھتا ہوں کہ لوگ وہم میں مبتلا ہیں۔“

”اور تم نے دو روپے بھی ہضم کر لئے.....!“

”میں نے آپ سے کسی رقم کا مطالبہ تو نہیں کیا تھا۔ آپ نے خوشی سے دیئے تھے۔ میں نے رکھ لئے تھے۔ انکار کیوں کرتا۔“

”اگر تم مجھے بتا دیتے کہ وہ کمرہ آسیب زدہ ہے.....!“

”آپ کبھی یقین نہ کرتے۔“ کلرک درمیان ہی میں بول پڑا۔ ”یہی سمجھتے ہیں کہ کسی دوسرے سے رشوت لے رکھی ہے۔ کوئی بھی نہیں یقین کرتا اس لئے میں انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہوں۔“

”یہ کب سے آسیب زدہ ہے۔“

”اس کے متعلق آپ کو سپروائزر ہی بتا سکے گا۔“

حمید تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر سپروائزر کے کمرے کی طرف مڑ گیا۔ یہ ایک دبلا پتلا اور یرقان زدہ سا آدمی تھا۔

اس نے حمید کو غور سے دیکھا اور ایک طویل سانس لی۔ پھر بولا۔ ”تشریف رکھئے جناب۔“ حمید نے بیٹھتے وقت اس کی میز پر ایک زوردار گونہ رسید کیا۔

”نہیں..... نہیں..... جناب..... میں بہت کمزور دل کا آدمی ہوں..... یہ دیکھئے..... دھڑکن.....!“ سپروائزر اپنی ہنٹنٹ ٹوٹا ہوا بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں تھا کہ وہ کمرہ آسیب زدہ ہے۔“ حمید ہاڑا۔

”آہستہ جناب آہستہ.....!“ سپروائزر گھگھیلیا۔ ”خدا کے لئے..... آہستہ بولئے..... ورنہ میرا ہارٹ فیل بھی ہو سکتا ہے۔ میں آپ کو ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ بھی دکھا سکتا ہوں..... یہ دیکھئے۔“

اس نے میز کی دراز کھینچی۔

”نہیں.....!“ حمید ہاتھ ہلا کر بولا۔ ”مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں پوچھتا ہوں تم نے مجھے اس کمرے کے متعلق بتایا کیوں نہیں تھا۔“

”کوئی یقین نہیں کرتا..... ویسے آپ خود سوچئے۔ کیا یہ معجزہ نہیں ہے کہ اس سیزن میں آپ کو فزارد کا کوئی کمرہ خالی نہیں ملے گا۔ شروع شروع میں ہم نے لوگوں سے بتایا تھا کہ وہ کمرہ آسیب زدہ ہے لیکن لوگ یہی سمجھتے تھے کہ ہم اسے کسی مقصد کے تحت خالی رکھنا چاہتے ہیں۔ اس

پر اکثر جھگڑا بھی ہو گیا ہے پھر ہم نے یہ کہنا بھی چھوڑ دیا کہ وہ آسیب زدہ ہے.... لوگ آتے ہیں اور خود ہی بوکھلا کر چلے جاتے ہیں۔ کسی بات کا تذکرہ تک نہیں کرتے۔ آپ پہلے آدمی ہیں جس نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔“

”یہ کب سے آسیب زدہ ہے۔“

”پچھلے ایک سال سے۔ اس کا لطیفہ بھی دلچسپ ہے جناب۔“ سپروائزر مسکرایا۔ ”پچھلے سال ایک صاحب تشریف لائے تھے.... کیا نام.... ہاں.... کرنل وارڈ صاحب۔ بھلا یہ نام کیسے بھلایا جاسکتا ہے۔ میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا ہے۔ عجیب و غریب شخصیت تھی۔ ہاں تو وہ تشریف لائے تھے۔ وہ کمرہ خالی تھا۔ مگر اس کی بنگ ایک سرکاری آفیسر کے لئے ہو چکی تھی۔ کلرک سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے ریڈر ویشن کارجر ڈیکے بغیر ہی اسے کرنل وارڈ کو دے دیا۔ تین دن بعد اس سرکاری آفیسر کا تار ملا کہ وہ آ رہا ہے۔ تب ہم سب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بقیہ سارے کمرے بہت دنوں سے بھرے ہوئے تھے ہم کس سے کہتے کہ وہ اپنا کمرہ خالی کر دے.... آخر کار ہم کرنل وارڈ ہی کے پاس پہنچے۔ اس نے سنا تو آپے سے باہر ہو گیا۔ کہنے لگا۔ ”تم کسی آفیسر کی بات کر رہے ہو۔ یہاں تو میرے علاوہ وزیراعظم بھی نہیں رہ سکتا۔“

ہم نے لاکھ سرچنا لیکن وہ نہ مانا۔ پھر میں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا کیونکہ منبر کا زلہ مجھ پر ہی گرا تھا۔ ذمہ داری میری تھی۔ میری ہی غفلت کی بناء پر وہ کمرہ کرنل وارڈ کو دے دیا گیا تھا۔ میرا حلیہ شاید اسے مضحکہ خیز معلوم ہوا تھا۔ وہ بے ساختہ ہنس پڑا اور بولا۔ ”اچھا بھئی تمہاری خاطر میں فی الحال یہ کمرہ چھوڑ رہا ہوں.... لیکن اسے لکھ لو کہ اس میں میرے علاوہ اور کوئی نہ رہ سکے گا۔ ہزاروں روحمیں میرے قبضے میں ہیں اور میں کرنل وارڈ ہوں۔ یہ نام ہمیشہ یاد رکھنا.... بس جناب کرنل وارڈ چلا گیا۔ وہ آفیسر صاحب تشریف لائے۔ لیکن اسی رات کو انہوں نے وہ چیخ وھاڑ مچائی کہ خدا کی پناہ۔ دو بجے رات کو انہوں نے کمرہ خالی کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ کمرے میں کوئی بُری روح گھس آئی ہے وہ اسی وقت کسی دوسرے ہوٹل میں چلے گئے تھے۔ دوسرے دن ہی کرنل وارڈ پھر موجود نظر آیا اور وہ کمرہ اسی کے استعمال میں رہا.... بس اب تو یہ سمجھ لیجئے کہ یہ کمرہ اس کے باپ کی جائیداد بن کر رہ گیا ہے۔ وہ جب بھی آتا ہے اُسے یہ کمرہ خالی ہی ملتا ہے۔“

”وہ کہاں سے آتا ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”دارالحکومت سے۔“

”ہوں.... تو وہ کوئی بُری روح ہے۔“

”خدا بہتر جانتا ہے جناب۔ ہم نے تو آج تک نہ کچھ دیکھا نہ سنا۔“

”خیر اب یہ بتاؤ کہ کیا اب ہم تمہارے ہی کمرے میں بستر لگائیں۔“

”میں کیا عرض کر سکتا ہوں جناب۔ اگر منبر صاحب فرمائیں تو آپ میری کھوپڑی پر بھی استراحت فرما سکتے ہیں۔“ سپروائزر نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ”میں اگر منبر صاحب کی جگہ ہوتا تو بتاتا اس کرنل وارڈ کو.... مگر ان کی تو اس کے نام ہی سے روح فنا ہوتی ہے.... میں کمزور دل کا آدمی ضرور ہوں جناب مگر یہ جن بھوت پری وغیرہ.... ان سے میں نہیں ڈرتا۔ بس میرے سامنے چیخ کر نہ بولے.... میز پر زور سے گھونسنہ نہ مارے۔ میرا دل فولاد کا ٹکڑا بن رہا ہے گا.... جی ہاں.... جناب....!“

حمید تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”میرے لئے کسی دوسرے ہوٹل میں انتظام کرو۔ ورنہ ہزاروں کو جہنم کا نمونہ بنادوں گا۔ کرنل وارڈ کی ایسی کی تھیں۔ اُسے بھی دیکھوں گا۔“

”وہ آج کل میں تشریف لانے ہی والے ہیں۔“ سپروائزر مسکرا کر بولا۔

”میرا خیال ہے کہ ان کی روحوں نے اسی لئے آپ کو اس کمرے میں نہیں ٹکنے دیا۔“

حمید نے سوچا کہ اب منبر سے جا نکلے۔ لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ وہ فی الحال یہاں سے چلا ہی جانا چاہتا تھا کیونکہ ابھی وادی کا جیک کا مسئلہ باقی تھا۔

وہ آصف کے پاس واپس آگیا۔ آصف اب بھی اسی طرح کرسی کی پشت سے ٹکا ہوا تھا.... اب اس کا سینہ تو لوہار کی دھونکی نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن پھٹی پھٹی آنکھوں سے اب بھی خوف جھانک رہا تھا۔

”ہم یہاں نہیں رہیں گے۔“ حمید نے کہا۔

اور آصف نے چونک کر پلکیں جھپکائیں۔ تھوڑی دیر تک خالی الذہنی کے سے انداز میں حمید کی طرف دیکھتا رہا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”یہی بہتر ہے۔“

”مگر....!“ آج کل یہاں کسی ہوٹل میں بھی گنجائش نہیں نکل سکے گی۔“

”پھر ہم واپس چلیں گے۔“ آصف جو بہت کچھ سنبھل چکا تھا میز پر ہاتھ مار کر بولا۔

”واپس چلیں گے۔“ حمید نے حیرت سے دہرایا۔

”نہیں تو پھر کیا سڑکوں پر ڈیرے ڈالتے پھریں گے۔“

”سیٹھ جی۔ آپ اپنے خادم کی توہین کر رہے ہیں۔“ حمید نے اوپری ہونٹ بھیج کر کہا۔

”یار مت پریشان کرو۔ میں تنگ آ گیا ہوں۔ بہت جلد پنشن لے لوں گا!“

”اس مہم کے بعد میں بھی کسی یتیم خانے کی منجبری کا ارادہ رکھتا ہوں!“ حمید سر ہلا کر بولا۔

”مگر اس وقت مسئلہ ہے سر چھپانے کا۔ ایک تجویز ہے میرے ذہن میں لیکن ہمیں ایک غیر سرکاری آدمی کے ساتھ قیام کرنا پڑے گا.... میرا دعویٰ ہے کہ اس نے کم از کم دو کمرے ضرور انتیج کئے ہوں گے۔ یا کم از کم اتنا بڑا کمرہ ضرور حاصل کیا ہو گا جہاں خود سما سکے۔“

”اوہ.... وہ دہو تو نہیں جو....!“

”ہاں.... وہی قاسم! شاید آپ اُسے جانتے ہیں۔“

”تمہارے ہی سلسلہ میں اکثر اس کا نام بھی سننے میں آیا ہے۔“

”ہاں تو پھر کیا آپ اس کے ساتھ رہ سکیں گے۔“

”میں گدھوں کے ٹھیکیدار کے ساتھ بھی رہ سکتا ہوں مگر یہاں اُس کمرے میں۔“

”ٹھہریے میں اُسے فون کرتا ہوں۔“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔ اتنے میں وہی لڑکی زیبا تیزی سے

ان کی طرف آئی دکھائی دی جس سے کچھ دیر قبل اس نے گفتگو کی تھی۔

”آپ لوگ وہ کمرہ چھوڑ رہے ہیں۔“ اُس نے آصف سے پوچھا۔

”جی.... جی ہاں....!“ آصف نے بوکھلا کر جواب دیا۔

”پھر اب کہاں جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ شاید آپ کو کہیں بھی کوئی کمرہ خالی نہ ملے۔“

”آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ہم کمرہ چھوڑ رہے ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”میں آپ سے بات نہیں کر رہی۔“ زیبا جھنجھلا کر بولی۔ ”سیٹھ صاحب سے مخاطب ہوں۔“

”ایک ہی بات ہے۔“ آصف نے خوش ہو کر کہا۔ ”یہ میرے سیکریٹری ہیں۔“

”ہوں گے۔ مجھے بالکل پسند نہیں ہیں.... ابھی سپروائزر نے بتایا کہ آپ کو بھی وہم نے

گھیرا ہے اور آپ کمرہ چھوڑ رہے ہیں۔“

”ارے یہ بات نہیں ہے۔“ آصف اڑ کر بولا۔ ”مجھے تو ذرا برابر بھی پرواہ نہیں ہے۔ لیکن

میں سیکریٹری کے بغیر کیسے رہوں گا۔ یہ حضرت بھاگ نکلیں گے۔“

”انہوں نے کسی عورت کو گاتے سنا تھا۔ یوں تو میں نے بھی کسی عورت کی آواز سنی تھی مگر

کیا میں ڈرتا ہوں۔“

”میرا تو دم نکلا جا رہا ہے۔“ حمید کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

آصف آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ غالباً اُسے ڈر تھا کہ کہیں حمید اپنا

اصلی روپ نہ دکھانا شروع کر دے۔

”رہائش کا انتظام تو ہو سکتا ہے۔“ زیبا نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اخراجات زیادہ ہوں گے۔“

”اخراجات کی پرواہ مت کرو۔ ہمیں اخراجات کی پرواہ کبھی نہیں ہوئی۔“ آصف انزربولا۔

”کیا سمجھیں....!“ حمید نے زیبا کو آنکھ ماری۔

”دیکھئے.... یہ دیکھئے۔“ زیبا اچھل پڑی۔

”کیا بات ہے۔“

”انہوں نے ابھی مجھے آنکھ ماری تھی.... صبح سے میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔“

”سیکریٹری....!“ آصف کو جھجھکے آگیا۔

”اب نہیں ماروں گا۔“ حمید نے مردہ سی آواز میں کہا۔ ”وینے اسے خوشی تھی کہ لڑکی رنگ

پر آگئی ہے اور اب وہ آصف کے پچھلے حساب بے باک کر سکے گا۔“

لڑکی پھر آصف کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”چھوڑی پیک پر میری بیوہ چچی کا ایک ہنٹ ہے۔ میں انہیں اپنے گھر لے جاؤں گی۔ لیکن

آپ کو کم از کم پندرہ روپے رومیہ کرایہ ادا کرنا پڑے گا۔ اور سیزن ختم ہونے سے پہلے آپ ہنٹ

نہیں چھوڑیں گے.... میری خدمات مفت! فرصت کے اوقات میں آپ کے کام کر دیا کروں گی

بات دراصل یہ ہے کہ چچی کی مالی حالت خراب ہے۔ اس طرح ان کی مدد بھی ہو جائے گی۔“

”بالکل بالکل....!“ آصف نے سر ہلا کر کہا۔ ”کیوں سیکریٹری۔“

”کئی بار بالکل سیٹھ صاحب۔“ حمید بولا۔

”دیکھا آپ نے....!“ زیبا براہِ سامنے بنا کر بولی۔ ”آپ کے سیکریٹری کو گفتگو کرنے کا سلیقہ

بھی نہیں ہے۔“

”سر چڑھا ہے۔ تم اس کی بھی فکر نہ کرو۔“ آصف نے شاہانہ انداز میں کہا اور حمید نے دل ہی دل میں اُسے ایک گندی سی گالی دی۔

”آپ اپنا سامان سیٹیں۔ میں گاڑی کا انتظام کرتی ہوں۔۔۔!“ زیبا نے کہا اور باہر چلی گئی۔

حمید اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

”یہ لڑکی مجھے الجھن میں مبتلا کر رہی ہے۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”اپنے پاس رکھو اپنی الجھنیں۔“ آصف نے برا سامنہ بنا کر کہا۔ ”اور محتاط رہو۔ ہم یہاں سڑکوں پر پڑے رہنے کے لئے نہیں آئے۔ ہزار روپیہ یومیہ بھی مجھے کواداکر نے پڑیں گے۔ اس قسم کے کام ہنسی کھیل نہیں ہوتے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔“ حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”لیکن اس لڑکی کو دیکھ کر میرے دل میں نہ جانے کیا ہونے لگتا ہے۔“

”حمید صاحب۔ میں فریدی نہیں ہوں۔ آپ کو میرا پابند رہنا پڑے گا سمجھے۔“

”سمجھ گیا۔“ حمید نے مردہ سی آواز میں کہا۔

”آپ اس لڑکی سے چیخڑ چھاڑ نہیں کریں گے۔“

”ہرگز نہیں۔۔۔ آپ کہیں گے تو ڈاڑھی چھوڑ کر گھیر دار شلوار پہننا شروع کر دوں گا۔ قتل کر دوں گا اس دل نامراد کو۔۔۔ ڈیوٹی از آفٹر آل ڈیوٹی۔“

اتنے میں ایک ویٹر لیس نے آکر حمید سے کہا۔ ”آپ کی ٹرنک کال ہے مسٹر ساجد۔“

حمید کاؤنٹر کی طرف مڑ گیا۔ ٹرنک کال فریدی کے علاوہ اور کس کی ہو سکتی تھی۔ حمید نے ریسیور کاؤنٹر کلرک کے ہاتھ سے لے لیا۔

”ہیلو۔۔۔!“ وہ ماؤتھ پیس میں چیخا۔

”کیپٹن حمید۔۔۔!“ دوسری طرف سے آواز آئی اور یہ آواز سو فیصدی نسوانی تھی۔ جب اچھل پڑا۔۔۔ یہ تو وہی آواز تھی۔ قطعی وہی آواز جو اس نے کچھ دیر پہلے آسب زدہ کمرے میں سنی تھی۔

”کون ہے۔“ حمید پھٹی پھٹی آواز میں بولا۔ ”میں ساجد ہوں۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”نہیں تم کیپٹن حمید ہو۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”میں انٹر نیشنل آرٹ ایگزیشن

سے چرواہی بول رہی ہوں۔۔۔ کمرہ چھوڑ کر کیوں بھاگے جا رہے ہو پیارے۔۔۔ میں تم سے عشق کروں گی۔۔۔ تمہیں بھی مصور بنادوں گی۔“

خوفزدہ لڑکی

حمید کے سارے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ انٹر نیشنل آرٹ ایگزیشن تو خیر اس کے ذہن کی دسترس سے باہر نہیں تھی۔ اسے علم تھا کہ دارالحکومت میں مصوری کی بین الاقوامی نمائش ہو رہی ہے۔ لیکن یہ چرواہی کیا بلا تھی اور اُسے مصوری سکھانے کا کیا مطلب تھا۔

”یہ کیا بکواس ہے۔“ حمید نے جی کڑا کر کے کہا۔ ”یہ کس کمرے کا تذکرہ ہے۔!“

”ارے۔۔۔!“ کھٹکتی ہوئی سی ہنسی کی آواز دوسری طرف سے آئی۔ پھر کہا گیا۔ ”کیا تم

میرے خوف سے کمرہ چھوڑ کر نہیں بھاگے جا رہے۔“

”پتہ نہیں تم کیا اوٹ پٹانگ بکواس کر رہی ہو۔ خدا جانے تمہارا مخاطب کون ہے۔۔۔ میں ساجد ہوں۔ تم نے جو نام لیا ہے غلط ہے۔۔۔ میں بیچارہ سیٹھ ہاشم بھائی کا سیکریٹری ہوں۔“

”آصف سے بڑا گدھا بھی آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔۔۔!“ دوسری طرف سے آواز آئی اور حمید نے جھلا کر ریسیور کریڈل میں بیچ دیا۔

حمید سوچ رہا تھا کہ اگر وہ کوئی بُری روح ہے تو ان سے کیا چاہتی ہے۔ وہ پھر آصف کی طرف پلٹ آیا جو اُسے اکتائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”کون تھا فون پر۔۔۔!“ آصف نے پوچھا۔

”میری چچی جان۔“ حمید نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”ان کے شوہر کے سالے کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے۔“

”پھر بیکار باتیں کرنے لگے۔“

”یہ میرا نجی معاملہ ہے سیٹھ صاحب۔ میں اپنی چچی جان کے شوہر کے سالے کے بہنوئی کے ہمزلف کے خسر کی بھی علالت کی اطلاع وصول کر سکتا ہوں۔ کوئی مجھے اس سے روک نہیں سکتا۔“

”آؤ.... میرے قریب آکر بیٹھ جاؤ۔ تمہاری مقدر میں ہو گا تو تم بھی سن لو....!“ حمید بولا۔
زیبا آگے بڑھی اور آرام کرسی کے قریب فرش پر اکڑوں بیٹھ گئی۔
حمید نے اس کے چہرے کا رنگ اڑتے دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ وہ بھی اُس گیت سے محروم

نہیں رہی۔

”میرے خدا....!“ زیبایک بیک اچھل کر دروازے کی طرف بھاگی۔
آصف جو پہلے ہی سے ”پاور ہوا“ تھا اس سے اُس بُری طرح ٹکرایا کہ دو چینی بیک وقت
کمرے میں گونج اٹھیں۔

”خدا غارت کرے۔“ حمید جھلا کر کھڑا ہو گیا۔ ”سیٹھ! آپ کبھی آدمی نہیں بن سکتے۔ آرٹ
سے محظوظ ہونے کا سلیقہ آپ میں کبھی نہیں پیدا ہو سکتا۔ اتنے حسین گیت کا بیڑا غرق کرادیا۔“
پھر وہ ہاتھ ہلا ہلا کر بڑے دردناک لہجے میں کہنے لگا۔

”گاؤ.... گاؤ.... اے روح بہار گاتی رہو.... تمہارے نئے روح کی جڑوں میں اترتے چلے
جاتے ہیں۔ خدا را میرے کانوں میں شربت گھولتی رہو۔“

آصف اور زیبا راہداری میں کھڑے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھ رہے تھے۔

”ارے نکلو یہاں سے....!“ آصف دونوں ہاتھ ہلا کر چنچا۔ ”کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔“

”آپ خود نکل جائیے۔“ حمید آنکھیں نکال کر بولا۔ ”میں روح بہار کو نہیں چھوڑ سکتا....“

مانا کہ آپ میرے والد ہیں.... پھر اس سے کیا.... وہ زمانے لد گئے جب اولادیں اپنی محبوباؤں کا
تذکرہ پاپوں کے سامنے نہیں لاتی تھیں۔ یہ بیسویں صدی ہے ابا جان.... کیا آپ نے کبھی عشق
نہیں کیا۔“

آصف بوکھلا کر سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ دفعتاً اس کے کانوں میں آواز آئی۔

”دفع ہو جاؤ تم لوگ پندرہ منٹ کے اندر ہی اندر کمرہ چھوڑ دو۔ ورنہ بڑے خسارے میں رہو
گے.... نکلو....!“

آصف کانپتا ہوا سامنے والی دیوار سے جا لگا۔

”کیا ہوا....“ سیٹھ صاحب۔ ”زیبا نے پوچھا۔“

”کچھ نہیں۔ خدا کے لئے اسے کسی طرح کمرے سے نکالو.... اس کا دماغ الٹ گیا ہے شاید۔“

”یاد ختم کرو۔ لڑکی نے ابھی اطلاع بھجوائی ہے کہ اس نے سواری کا انتظام کر لیا ہے۔ اب
چلو سامان سمیٹیں۔“

حمید چپ چاپ اُس کے ساتھ کمرے میں چلا آیا۔

”اچھا بیٹا سیٹھ جی۔“ حمید بڑبڑایا۔ ”تم بھی کیا یاد کرو گے۔ بڑی ڈینگیں مار رہے تھے لونڈیا کے
سامنے اب میں تمہیں دیکھوں گا۔“

پھر وہ بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ پاپ میں تمباکو بھر کر اُسے سلگایا اور ہلکے ہلکے کش
لیتا ہوا آرام کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔

تھوڑی دیر بعد باہر سے قدموں کی آواز آئی لیکن حمید نے مڑ کر دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔
”اور یہ حضرت یہیں تشریف فرما ہیں۔“ اس نے زیبای کی آواز سنی۔ لیکن اس کی پوزیشن
تبدیل نہ ہوئی۔ اُسی طرح آرام کرسی کی پشت سے ٹکا ہوا پاپ کے کش لیتا رہا۔

”یہ خود بھی.... خود بھی بھوت ہی ہے....!“ آصف کی بھرائی ہوئی سی آواز کمرے میں گونجی۔
حمید نے ہونٹوں سے پاپ نکالا اور ہونٹ سکڑ کر ان کی طرف مزے بغیر بولا۔ ”میں

ہر حال میں عورت کا غلام ہوں۔ سیٹھ صاحب! چاہے وہ چڑیل ہی کیوں نہ ہو۔ وہ اس وقت بھی
مجھے ایک فلمی گیت سنار ہی ہے۔“

”یہ حقیقت بھی تھی.... کوئی عورت ہو لے ہو لے اس کے کانوں میں مسلسل گار ہی تھی۔“
”اجی چلے آؤ.... اچی چلے آؤ....!“

”میں تو کچھ بھی نہیں سن رہی۔“ زیبائے کہا۔

”اس وقت تو میں بھی کچھ نہیں سن رہا۔“ آصف بولا۔

”لیکن اگر اس وقت کوئی جھ سے میرا نام پوچھے تو میں ہر حال میں میگافون بتاؤں گا۔“ حمید

نے لا پرواہی سے کہا۔

”ارے اب اٹھو گے بھی۔“ آصف جھلا کر بولا۔

”پورا گیت سننے کے بعد.... فلم ہلا کو کا ایک طریقہ یہ گیت ہے جس نے ہلا کو کو ہلا کو ہلا

تھا.... ورنہ آئندہ نسلیں اُسے شیخ چلی کہتیں....!“

”تم جھوٹے ہو....!“ زیبائے کہا۔

بیوہ چچی بھی بڑی گریٹ عورت معلوم ہوتی ہے جس نے چھوری پیک پر ہٹ بنوار کھا ہے۔
یہ ہٹ تین آرام دہ کمروں پر مشتمل تھا۔ یہاں حمید کو ایک بوڑھی عورت نظر آئی جو اس عمر
میں بھی خاصی وجیہ تھی۔ خود خال چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ وہ اپنا حکم منوانے کی عادی ہے۔
شاہد نادر مسکراتی بھی ہوگی۔

اس نے ان کا استقبال خندہ پیشانی سے کیا اور کافی دیر تک اپنے ہٹ کے متعلق خاکسارانہ
انداز میں گفتگو کرتی رہی جس کا لب لباب یہی تھا کہ انہیں یہاں آرام ضرور ملے گا۔ خواہ اس ہٹ
میں دنیا بھر کی بلائیں ہی کیوں نہ موجود ہوں۔ پھر حمید کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”انہیں کیا ہوا
ہے۔ کیا یہ بیمار ہیں۔“

”اوہ.... ہاں آئی۔“ زبیا نے کہہ۔ ”ان پر اختلاج قلب کے دورے پڑتے ہیں۔“
”چیخ چیخ....!“ آئی نے چہرے پر اداسی طاری کر کے کہا۔ ”بڑا نامراد مرض ہے.... خدا
محفوظ رکھے۔“

”ارے بھی کیا ہوا۔“ آصف جھنجھلا کر بولا۔
”جب سے.... جب سے۔“ حمید ہچکیاں لیتا ہوا ہکٹانے لگا۔
”جب سے میری ماں کا انتقال ہوا ہے میں بوڑھی.... عورتوں کو دیکھ کر.... اسی.... اسی
طرح رو پڑتا ہوں۔“
”کیا بات ہوئی....!“ آصف آنکھیں نکال کر بولا۔

”ہائے.... میں سوچتا ہوں کہ یہ بھی جلد ہی مرجائیں گی۔“ حمید ہچکیاں لیتا ہوا بولا۔ زبیا
بے ساختہ ہنس پڑی۔

”کیوں دانت نکالتی ہے لڑکی....!“ آئی نے چیخ کر کہہ۔ شاید حمید کی بیباکی گراں گزری تھی۔
تھوڑی دیر بعد وہ سب اپنے ٹھکانوں پر پہنچ گئے.... حمید اور آصف الگ الگ کمروں میں تھے
اور زبیا کی آئی نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ اگر تیسرے کمرے کو یہ خود استعمال کرتی رہے تو کیا
حرج ہے.... اس طرح ان دونوں کی دیکھ بھال بھی ہو سکے گی۔

کوئی حرج نہیں ہے۔“ آصف نے زبیا سے کہہ۔ ”یہ بڑی اچھی بات ہے۔“
اتنے میں حمید بھی آصف کے کمرے میں پہنچ گیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”آسیب کا سایہ ہو گیا ہے۔“
”خبردار اگر کسی نے کمرے میں قدم بھی رکھا۔“ حمید دھاڑا۔ ”جدا کر خاک کردوں گا۔ اس
وقت چاند سورج میری مٹھی میں ہیں اور روح بہار میرے گرد و قص کر رہی ہے۔ چلے جاؤ....
چلے جاؤ۔“

وہ چیخا رہا ”چلے جاؤ.... چلے جاؤ۔“ پھر چکر کر گر پڑا.... دانت پر دانت جمائے اور جسم اس
طرح اکڑا لیا کہ اٹھائے جانے پر شاید کسی پتھر کے بت کی طرح سیدھا اٹھتا چلا جاتا۔
”اوہ.... یہ کیا ہو.... کیا ہوا....!“ اس نے آصف کی گلوگیر آواز سنی۔
”شاید بیہوش ہو گیا ہے۔“ زبیا کی آواز آئی ”ٹھہریے۔ میں آدمیوں کو بلاتی ہوں۔ آپ
بالکل نہ گھبراہٹیں۔“

پھر سنانا چھا گیا اور وہ اسی طرح چاروں شانے چت پڑا رہا۔
کچھ دیر بعد اُسے اپنے جسم کی اکڑن کے کمالات دکھانے پڑے۔ یہ اس وقت کی بات ہے
جب اسے فرش سے اٹھانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔
”میرے خدا.... جسم بالکل پتھر ہو کر رہ گیا ہے....“ کسی نے کہا تھا اور پھر حمید کو تھوڑی
دیر تک دوسروں کے ہاتھوں پر سفر کرنا پڑا تھا۔ ڈائیننگ ہال کے فرش پر ایک کمبل بچھایا گیا اور حمید
کو اس پر ڈال دیا گیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر ہی کی باری تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے تک یہی سب کچھ ہوتا
رہا۔ ڈاکٹر نے پے درپے اُسے تین انجکشن دیئے جس کے اثر سے اُسے اپنے اندر انگارے بھرے
ہوئے معلوم ہونے لگے تھے۔ لیکن اس کی پیشانی پر شکن تک نہیں آئی تھی۔ غرضیکہ بڑی مشکل
سے اُسے ہوش آیا تھا۔ شاید وہ آصف کو بور کرنے کیلئے بیہوشی کی مدت کچھ اور طویل کر دیتا مگر
اب وہ خود بھی بور ہونے لگا تھا۔

پھر آدھ گھنٹہ طبیعت سنبھالنے میں لگ گیا۔ اس کے بعد وہ ایک بڑی سی دین میں بیٹھ کر
چھوری پیک کی طرف روانہ ہو گئے۔ حمید بالکل خاموش تھا.... آصف اور زبیا اُسے پھنی پھنی سی
نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

چھوری پیک کا سفر زیادہ طویل نہیں تھا آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ گئے۔ چھوری پیک بڑی
یہاں جگہ جگہ لکڑی کے رنگین ہٹ نظر آتے تھے.... حمید سوچ رہا تھا کہ زبیا کا

”اس سے پریشان کن اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔“

”کیا مطلب....!“ آصف بھٹا گیا۔

”میں صبح سے شام تک زار و قطار روتا ہی رہوں گا۔“

”یار.... ہمپ.... سیکریٹری.... تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“

”نہیں میں وہاں جا رہا ہوں....“ حمید نے کھڑکی سے افق کی طرف اشارہ کیا۔ ”روح بہار

گارہی ہے.... اچی چلے آؤ.... اچی چلے آؤ.... میں جاؤں گا مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔“

دفینا آصف کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آنے لگے۔ زیبا بھی متحیر سی دکھائی دیتی تھی۔

”بڑی مصیبت ہے۔“ آصف بڑبڑایا۔ ”میں تو سمجھا تھا کہ اب ٹھیک ہو گیا ہو گا۔“

”اور میں سوچتی ہوں کہ اگر آئی کاس کا علم ہوا کہ ان پر آسیب کا سایہ ہے تو وہ آپ لوگوں

کو یہاں نکلنے ہی نہ دیں گی۔“

اور حمید یہی چاہتا بھی تھا۔ پہلے اس نے سوچا تھا کہ قاسم کا ساتھ ہو جائے گا۔ پھر مزے ہی

مزے ہوں گے۔ مگر یہ زیبا غیر متوقع طور پر درمیان میں آکودی تھی۔

”دیکھو بھئی۔“ آصف نے حمید سے کہا۔ ”تم اپنی روح بہار کے متعلق دل ہی دل میں سوچنے

رہو۔ زبان سے کچھ نہ کہو۔ ورنہ ہم اس سے بھی نکالے جائیں گے۔“

”میں زبان سے کیسے نہ کہوں.... چاند سے کہئے کہ وہ چمکتا رہے۔ چاندنی نہ پھیلائے۔ پانی

سے کہئے کہ وہ بہتا رہے۔ لیکن پیاس نہ بجھائے۔ بارہ سنگھے سے کہئے.... بارہ سنگھے.... لے....

لے.... سے....!“

حمید ٹھوڑی سمجھتا ہوا کچھ سوچنے لگا اور پھر چونک کر بولا۔ ”ہاں تو میں ابھی کیا کہہ رہا تھا۔“

”تم صرف بکواس کر رہے تھے مگر میں کہہ رہا ہوں کہ کہیں تمہیں سرکاری طور پر پاگل خانہ

میں نہ بھجوا دیا جائے۔“

”اس نے یہی کہا تھا کہ میں تمہیں پاگل خانے میں ملوں گی.... مجھے وہیں بھجوا دیجئے۔“

جان۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔“

”ابا جان۔“ اس نے کچھ ایسے انداز میں کہا تھا کہ زیبا ہنس پڑی۔ ظاہر ہے کہ اس پر آصف

نے انگارے ہی چبائے ہوں گے۔

”جاؤ.... جاؤ تم اپنے کمرے میں....“ وہ اُسے دروازے کی طرف دھکیلتا ہوا بولا۔

حمید نے مزاحمت نہیں کی۔ چپ چاپ اپنے کمرے میں واپس چلا آیا.... وہ بے تحاشہ قطعیت

لگانا چاہتا تھا کیونکہ آصف کو بکرا بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

یہ سب کچھ تھا مگر وہ آواز مستقل طور پر الجھن کا باعث بن گئی تھی اس نے فون پر اُسے

صاف پہچانا تھا۔ وہ آسیب زدہ کمرے والی آواز سے مختلف نہیں تھی مگر نیشنل آرٹ گیلری اور

چرواہی کا کیا مطلب ہوا۔

اُسے اس سلسلے میں فریدی سے فون پر گفتگو کرنی چاہئے مگر کس وقت اور کہاں سے۔ یہاں

اسی ہٹ میں فون نہیں تھا وہ سوچتا رہا کچھ دیر بعد خیالات کی رو پر اسرار کرئل وارڈ کی طرف

مڑی۔ وہ کون تھا اور اکثر و بیشتر ٹیکم گڈھ کیوں آیا تھا۔ اپنی کسی سیاہ روح سے فزار و کا ایک کمرہ کیوں

بیکار کر دیا تھا۔ فزار و کا عملہ اس سے خائف بھی رہتا تھا۔

اب حمید نے سوچا کہ ان سوالوں کے جوابات مستقل طور پر پاگل بنے رہنے سے نہ مل سکیں

گے۔ اس لئے کبھی کبھی ہوش کی باتیں بھی کرنی چاہئیں۔

لہذا دوسری صبح جب وہ سوکر اٹھا تو آصف نے اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں دیکھی

سوائے اس کے کہ وہ اُس ہٹ میں اپنی موجودگی پر اظہار حیرت کر رہا تھا.... ناشتے کی میز پر زیبا کی

آئی بھی موجود تھی۔ حمید نے آصف سے اس کے متعلق کچھ نہیں پوچھا لیکن چہرے کے اتار

چڑھاؤ نے اسے سمجھا دیا کہ وہ اُس بوڑھی عورت کو بھی حیرت سے دیکھ رہا ہے۔

”اب آپ کی طبیعت کیسی ہے جناب۔“ بوڑھی نے پوچھا۔

”جی.... ٹھیک ہوں محترمہ۔“ حمید نے ایسے انداز میں کہا جیسے اپنے جواب سے مطمئن نہ

ہو اہو یا یہ جواب یونہی سمجھے ہوئے بغیر دیا گیا ہو۔

ناشتے کے بعد بوڑھی چلی گئی اور آصف نے حمید سے پوچھا۔

”یار اب تم ٹھیک ہونا۔“

”مجھے کیا ہوا ہے۔“ حمید نے حیرت سے کہا۔ ”لیکن ہم یہاں کب اور کیسے آئے! یہ غالباً

چھوری پیک ہے۔ مگر زیبا کہاں ہے۔“

آصف نے اُسے بتایا کہ اس آسیب زدہ کمرے میں اس پر کیا گزری تھی۔

”کبھی کہیں نگلی لاشیں ملتی ہیں! کبھی فزارو کے کمرے میں روہیں ناچتی ہیں کبھی وادی کا جیک میں دھوئیں کا منارہ تیار ہو جاتا ہے۔“

”دھوئیں کا منارہ۔“ زیبا بڑبڑائی۔ ”یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”سنا ہے تم نے اس کے متعلق؟“ حمید نے سوال کیا۔

”ٹیکم گڈھ ایسی حیرت انگیز خبروں کے لئے مشہور ہے۔“ زیبا مسکرائی۔

”ایسی ہوائیاں عموماً یہیں سے چھوٹی ہیں۔“

”تو تمہیں اس پر یقین نہیں آیا۔“

”میں اس وقت تک کسی چیز پر یقین نہیں کرتی جب تک کہ اسے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں۔“

یک بیک آصف اچھل پڑا۔۔۔ حمید نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پلکیں چپکائیں۔

”اس نے تو یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑا۔“ آصف بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”وہ ہنس رہی ہے۔ تمہیں لگا رہی ہے۔“

”اب سیٹھ صاحب۔“ زیبا دانت پیس کر بولی۔ ”خدا کے لئے یہاں یہ سب کچھ نہ پھیلاؤ۔ ورنہ آئی۔“

اس نے جملہ نہیں پورا کیا۔ وہ ایک صوتی جھٹکے کے ساتھ خاموش ہو گئی۔ اس کی نظریں کھڑکی سے باہر تھیں۔۔۔ اور چہرے سے خوف ظاہر ہو رہا تھا۔

”کیا بات ہے۔“ حمید نے کرسی سے اٹھے بغیر پوچھا۔

”کرئل وارڈ۔۔۔!“ زیبا کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔ آصف اور حمید دونوں ہی جھپٹ کر کھڑکی کے پاس پہنچ گئے۔

ٹوکنے والے

تین چار سو گز کے فاصلے پر سیاحوں کا ایک قافلہ گزر رہا تھا۔ یہ سب خچروں پر سوار تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔

”مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں۔“ حمید اپنی پیشانی رگڑتا ہوا بڑبڑایا۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے۔“

پھر وہ کافی دیر تک اُس آسیب زدہ کمرے کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ اس دوران میں وادی کا جیک کا تذکرہ بھی نکلا تھا۔ لیکن حمید نے اُسے آگے نہیں بڑھنے دیا تھا۔

گیارہ بجے زیبا آئی۔ حمید نے سوچا کہ اس سے کرئل وارڈ کے متعلق معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں کیونکہ وہ بھی بہت دنوں سے فزارو میں کام کرتی ہے۔

”میں معافی چاہتا ہوں محترمہ زیبا۔۔۔!“ اس نے اس سے کہا۔ ”سیٹھ سے معلوم ہوا ہے کہ کل میں کچھ بہک گیا تھا۔“

”اوہ تو کیا اب یہ ٹھیک ہیں۔“ اس نے آصف سے پوچھا اور آصف نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”یہ تو بڑی اچھی بات ہوئی۔“ زیبا خوش ہو کر بولی۔ ”ورنہ آئی! مجھے بھی چھیل کر رکھ دیتیں۔“

”کیا کرئل وارڈ آگیا۔“ حمید نے پوچھا۔

”کرئل وارڈ۔۔۔ نہیں تو۔۔۔!“

”کیا یہ حقیقت ہے کہ اس بکرے کی آسیب زدگی میں اسی کا ہاتھ ہے۔“

”خدا جانے مشہور تو یہی ہے۔ ارے وہ بھی تو دارالحکومت ہی میں رہتا ہے۔ کیا آپ اُسے نہیں جانتے۔“

”نہیں! میں نے پہلی بار اس کا نام سنا ہے۔ کیوں سیٹھ صاحب۔“

”ہاں بھئی۔۔۔!“ آصف نے کہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

”کیا فزارو والے اس سے خائف رہتے ہیں۔“

”بہت زیادہ۔۔۔!“ اس کی صورت ہی سے معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ٹوٹی پھوٹی قبروں میں رائدہ گزرتا ہو۔

”یہاں اکثر وہ پہاڑوں پر ہڈیاں اور کھوپڑیاں تلاش کرتا پھر تا ہے۔“

”فزارو کا منیجر اس کی زبردستیوں کے خلاف رپورٹ کیوں نہیں کرتا۔“

”ارے اس کی تو روح فنا ہوتی ہے اُس سے۔ حالانکہ کرئل کی وجہ سے فزارو کی شہرت

بھی نقصان پہنچا ہے۔“

”ٹیکم گڈھ واقعی بڑی عجیب جگہ ہے۔“ حمید نے طویل سانس لے کر کہا۔

”اچھی بات ہے.....!“ زبیا نے آہستہ سے کہا اور سر جھکا لیا۔

آصف فاتحانہ نظروں سے حمید کی طرف دیکھ رہا تھا اور حمید نے اپنے چہرے پر ندامت
ظاہر کر لی تھی۔

اسی شام کو وہ ایک قافلے کے ساتھ وادی کاجیک کی طرف روانہ ہو گئے۔ حمید نے فون پر
فریدی سے رابطہ قائم کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اُسے
فریدی کی طرف سے اس قسم کی کوئی ہدایت نہیں ملی تھی اور اُسے یہ بھی یاد آگیا تھا کہ انہیں
یہاں بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ فریدی کی دانست میں کوئی دھوکے میں رہے۔

اُس نے یہ بھی تو کہا تھا کہ آج کل کوئی اُسے شہر میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ کسی نے اُسے جنوبی
امریکہ میں کسی کام کا آفر بھی دیا تھا۔

بہر حال وہ فریدی کو موجودہ حالات سے آگاہ کئے بغیر وادی کاجیک کی طرف روانہ ہو گیا۔
موسم بہار میں رات کا سفر بھی وہاں تفریح ہی میں داخل ہوتا تھا۔ مگر آج کل اندھیری
راتیں تھیں پھر بھی سفر تو ہوتے ہی تھے۔

یہ سفر یہاں سے زیادہ لمبا بھی نہیں تھا۔ وہ چار بجے روانہ ہوئے تھے اور انہیں توقع تھی کہ
آٹھ بجے تک حفاظتی چوکی کے قریب پہنچ جائیں گے۔
یہ جگہ ان اطراف کی بہت پرانی تفریح گاہ تھی۔ لیکن آج کل تو دھوکے کا منارہ ہی وہاں کے
سفر کا محرک ہوا کرتا تھا۔

سینکڑوں فٹ گہری وادی کاجیک سیاحوں کے لئے بڑی کشش رکھتی تھی اوپر خیمے لگائے
جاتے تھے۔ خوب رنگ رلیاں ہوتی تھیں اور نیچے اترنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ مگر بہت کم ایسے
ہوتے جنہیں کامیابی ہوتی۔ یہ عموماً مضبوط جسم اور آہنی اعصاب رکھنے والے لوگ ہوتے تھے۔
کیونکہ نیچے پہنچ کر پھر اوپر آنا معمولی قوت کے لوگوں کے بس کا روگ نہیں تھا۔

ویسے وادی کاجیک کی دلکشی تو اوپر سے بھی محسوس کی جاسکتی تھی۔ اس پر گیت لکھے جاسکتے
تھے۔ اُسے کہانیوں کا پس منظر بنایا جاسکتا تھا۔ رنگوں اور برش کی بددے اُسے کیوناس پر محفوظ کیا
جاسکتا تھا۔

آٹھ بجے وہ حفاظتی چوکی کے قریب پہنچ گئے۔ چوکی یہاں سے ایک یا ڈیڑھ میل کے فاصلے پر

”کہاں ہے کرنل وارڈ.....!“ حمید نے پوچھا۔

”وہ سب سے پیچھے سیاہ خنجر پر..... اُس کے سر پر سفید سمور کی ٹوپی ہے۔“

حمید اتنے فاصلے سے خط وخال کا صحیح اندازہ نہ کر سکا لیکن تن و توش تو بہر حال نظر آرہا تھا۔
اس کے جسم پر تبت کے بکشتوں کا سالباہہ تھا اور اس پر سفید سمور کی ٹوپی کچھ عجیب سی لگ رہی
تھی..... اور وہ کوئی قدیم تاتاری معلوم ہو رہا تھا۔

”یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں.....!“ حمید نے پوچھا۔

”میری دانست میں تو وہی افواہ انہیں وادی کاجیک کی طرف لے جا رہی ہے۔“

”اوہ..... سیٹھ جی۔“ حمید آصف کی طرف مڑا۔ ”کیوں نہ ہم بھی چلیں۔“

”ارے بیکار ہے.....!“ زبیا بولی۔ ”میں انہیں احق سمجھتی ہوں جو محض افواہوں پر اپنی

انرجی اور دولت برباد کرتے پھریں۔“

”سیٹھ صاحب احق ہی ہیں..... اور..... ہم..... مطلب یہ کہ..... انہیں۔“

”کیا کمواس ہے.....!“ آصف آنکھیں نکال کر بولا۔

”ز..... زبان..... لڑکھڑاگئی تھی سیٹھ جی۔“

زبیا ہنسنے لگی اور آصف نے بلند آواز میں کہا۔ ”ہاں ہم وادی کاجیک ضرور چلیں گے ذرا
دیکھیں تو..... کیا بلا ہے وہ۔“

”خیر ویسے تو وہ ایک خاصی اچھی تفریح گاہ ہے۔ موسم بہار میں وہاں کئی مقامی فرمیں بڑی
اچھی کمائی کر لیتی ہیں۔“ زبیا بولی۔

”وہ کیسے.....!“

”بس جنگل میں منگل! سرحدی حفاظتی چوکی سے ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر خیمے لگائے
جاتے ہیں۔ جو سیاحوں کو کرائے پر دیئے جاتے ہیں۔ دو تین گشتی قسم کے ہوٹل ہوتے ہیں، جو
سیاحوں کے لئے ان کی ضروریات مہیا کرتے ہیں۔“

”تب تو بڑا لطف رہے گا سیٹھ جی۔“ حمید خوش ہو کر بولا۔ پھر اُس نے زبیا سے کہا۔ ”تم بھی چلو۔“

”تم کون ہوتے ہو مجھ سے کہنے والے۔“ زبیا آنکھیں نکال کر بولی اور پھر آصف کی طرف

دیکھنے لگی۔ آصف صاحب بڑے پیار بھرے لہجے میں بولے۔ ”چلو.....!“

پھر اچانک نہ صرف یہ مشکل آسان ہو گئی بلکہ وہ خوشی کے مارے اچھل بھی پڑا۔۔۔۔۔ قاسم ایسا تو نہیں تھا کہ ہزاروں کا مجمع بھی اُسے چھپا سکتا۔ وہ اپنی میز پر تنہا نہیں تھا بلکہ کئی مرغ مسلم اور دو ایک مسلم رانیں بھی تھیں اور آس پاس کے لوگ اُسے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے وہ میز کی صفائی کے بعد انہیں بھی کھا جائے گا۔

حمید اس کی جانب بڑھا ہی تھا کہ اس کی نظر بھی اُس پر پڑ گئی۔۔۔۔۔ اور وہ گرد و پیش کی پرواہ کئے بغیر کھڑا ہو کر چیخا۔ ”آمین۔۔۔۔۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گیا۔ ٹھیکے کی نہیں تو!“

حمید بوکھلا گیا وہ جانتا تھا کہ اُس کی اس حرکت کی بناء پر اُسے بھی لوگ گھورنے لگے ہوں گے۔ لیکن وہ کسی کی طرف دیکھے بغیر قاسم کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

”بیٹھو۔۔۔۔۔ پیارے۔۔۔۔۔ ہاتھو۔۔۔۔۔!“ قاسم کی بانچیس کھلی پڑی تھیں۔ ”فزارو گیا تو معلوم ہوا کہ تم شائد ادھر آئے ہو۔ یہاں دوپہر سے جھک مارتا پھر رہا ہوں۔ تمہارا پتہ نہیں۔“

”خیمہ ہے تمہارے پاس۔“ حمید نے پوچھا۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ چکا تھا۔

”ہے قیوں نہیں! ذیل دام پر لیا ہے۔ حمید بھائی۔۔۔۔۔ کوئی سالا کھالی ہی نہیں تھا۔ ایک آدمی مل گیا جو یہاں سے جانا چاہتا تھا۔ مگر یہ سالے ہفتے بھر کے پیسے بیٹگی لے لیتے ہیں چاہے تم ایک

دن رہو چاہے ایک ہفتہ وہ جانا چاہتا تھا۔ اس لئے مجھے ذیل دام پر دے گیا۔“

”مزے کرو۔“ حمید نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”ہم تو کھلی چٹان پر رات گزاریں گے۔“

”قیوں۔۔۔۔۔!“

”ہمیں کوئی خیمہ نہیں مل سکا حالانکہ ہمارے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔“

”لُل لڑکی۔۔۔۔۔!“ قاسم نے نیچے ہوٹ پر زبان پھیر کر کہا۔ ”نک۔۔۔۔۔ کون لڑکی۔“

”خاصی گھڑی ہے۔۔۔۔۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا۔

”امیں حمید بھائی۔ تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔“ قاسم فصیلے لہجے میں بولا۔

”کیوں۔۔۔۔۔؟“ حمید نے پوچھا۔

”امیں کیا وہ سالا خیمہ اپنی قبر میں لے جاؤں گا۔ وہیں آؤ۔۔۔۔۔ چٹان پر مت لیٹو۔ یہ بھی قوی

بات ہوئی۔ کمال کر دیا۔۔۔۔۔ حمید بھائی۔۔۔۔۔ جیتے رہو۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ پھر قاسم ہی نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ”تمہارے ساتھ وہ ملے خاں بھی

نہی۔ زیبا نے رواںگی سے پہلے ہی خدشہ ظاہر کیا تھا کہ شائد انہیں کوئی خیمہ کرائے پر نہ مل سکے کیونکہ زیادہ تر لوگ پہلے ہی سے بنگلے کرائے رکھتے تھے۔ حمید نے اس کی پرواہ نہیں کی تھی کیونکہ وہ کسی چٹان پر کھل چٹان سے سو سکتا تھا۔ البتہ آصف کو جب یہ معلوم ہوا کہ زیبا کی پیشین گوئی کے مطابق چچ انہیں کسی کھلی چٹان ہی پر رات بسر کرنی پڑے گی تو اُسے حمید پر بے تحاشہ تاؤ آگیا۔

”یار تم ہمیشہ ایسی ہی حرکتیں کرتے رہتے ہو۔“ اس نے لالیلی آنکھیں نکالیں۔

”خاموش رہو۔۔۔۔۔ سیٹھ۔۔۔۔۔!“ حمید نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”میں اس وقت پھر روح بہار

کے گیت سن رہا ہوں۔“

”جہنم میں جاؤ۔۔۔۔۔ میں چٹان پر بھی پڑا رہ سکتا ہوں۔ مگر یہ زیبا۔“

”زیبا کو پلکوں میں جگہ دیجئے آنکھوں پر بٹھائیے اور اندھے ہو جائیے۔“

”تم ہوش میں ہو یا نہیں۔۔۔۔۔!“

”میں جسے بھی چاہوں یہیں اسی جگہ غارت کر سکتا ہوں۔ روح بہار اس وقت میرے پاس موجود ہے۔۔۔۔۔ کہہ رہی ہے کہو تو اس بوڑھے کو اٹھا کر نیچے وادی میں پھینک دوں۔۔۔۔۔!“

”اوہ۔۔۔۔۔! سیٹھ خدا کے لئے خاموش رہو۔ بات نہ بڑھاؤ۔“ زیبا جلدی سے بولی۔ انہوں نے

ایک شفاف سی چٹان پر بستر ڈال دیے تھے۔ وہ اکیلے بھی نہیں تھے۔ انہی جیسے نہ جانے کتنوں نے

کھلی چٹانوں پر ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ آج کل کھلے میں بھی ایک یا دو کمبل سے زیادہ سردی نہیں

ہوتی تھی۔

حمید انہیں وہیں چھوڑ کر منہ گشتی کے لئے نکل گیا۔ خیموں کے آس پاس پیٹر و میکس لیمپوں

کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

ایک جگہ ایک بڑا شامیانہ نظر آیا جسے چھ فٹ اونچی قناتوں سے احاطہ کیا گیا تھا۔۔۔۔۔ آٹا

رفت کے راستے پر ”کیف شبانہ“ کا بورڈ آویزاں تھا۔ حمید اس ہوٹل کے نام ہی پر جھوم اٹھا۔ اند

پہنچا تو ساری ہی میزیں بھری ہوئی نظر آئیں۔ مگر وہ سوچ رہا تھا کہ واپس جانے کا نتیجہ بے خوابی کی

صورت میں ظاہر ہو گا اور وہاں رکنے کی صورت میں بیٹھنے کی جگہ تو مشکل ہی سے ملے گی۔ شائد کمر

ہی رہنا پڑتا۔

ہیں.... ابے یہ وہی تو نہیں ہے جس سے ایک بار تمہارا جھگڑا ہوا تھا بانی سرکل میں.... ابے تم اس سالے کو اپنا آفسر کہتے ہو۔ کرٹل صاحب کہاں رہ گئے۔“

”قاسم بھائی کیا بتاؤں۔“ حمید مسکمی صورت بنا کر بولا۔ ”میں تو بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ اب تم ہی جو کچھ کرنا چاہو کرو....!“

”قیامت ہے.... کرنا ہے.... غوک....!“ وہ نوالہ حلق سے اتارتا ہوا بولا۔

”وہ لڑکی دراصل میں نے تمہارے لئے منتخب کی تھی مگر وہ اُلوکا داماد....!“

”اُلوکا داماد....!“ قاسم حیرت سے آنکھیں نکال کر بولا۔ ”اے نہیں.... ہاہا....!“

”یعنی کہ وہی پلپلے خاں جھٹک لے گیا اس لڑکی کو.... پتہ نہیں کیوں وہ بھی اسی پر لٹو ہو رہی ہے۔“

”ٹٹو.... ہو رہی ہے۔“ قاسم نے پھر حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں۔

”لٹو.... لٹو....!“

”لٹو کیا ہوتا ہے حمید بھائی....!“ قاسم نے بے بسی سے پوچھا۔

”ابے لٹو ہونا محاورہ ہے۔“

”اچھا تو وہ سالی محاورہ ہو گئی ہے۔“ قاسم سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلا کر بولا۔ پھر اچانک سر اٹھا کر کہا۔ ”یار.... کیا بات ہوئی.... وہ محاورہ کیسے ہو سکتی ہے.... محاورہ کیا چیز ہے۔“

اُسے تو شاید قائلہ کہتے ہیں۔“

”ہائیں یہ قائلہ کیا بلا ہے....!“ حمید اُسے گھورنے لگا۔

قاسم دونوں آنکھیں مار کر مسکراتا اور آہستہ سے بولا۔ ”ابے وہ پیٹ میں بچہ دچہ....!“

”اُلوکا کے پٹھے....!“ حمید کی زبان سے نکلا اور ساتھ ہی قہقہے کی دھار بھی۔

قاسم بھی اس کے ساتھ ہی یونہی خواہ خواہ ہنستا ہا پھر یک بیک چومک کر خاموش ہو گیا۔ ار

کے چہرے پر گہری سنجیدگی نظر آرہی تھی۔

”کیا کہا تھا تم نے۔“ دفعتاً اُس نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

”میں نے کچھ بھی تو نہیں.... تمہیں غلط فہمی....!“

”غلط کی ایسی کی تھی.... فہمی کی دم میں عمدہ.... تم نے مجھے اُلوکا پٹھا کہا تھا۔“

”ارے.... وہ تو میں نے آصف کو کہا تھا.... کمال کرتے ہو یار۔“

قاسم کی آنکھیں اس کے باوجود بھی نکلی ہی رہیں۔ لیکن پھر اچانک وہ مسکرا کر بولا۔ ”کھیر توئی بات نہیں۔“

”میں دراصل یہ چاہتا ہوں کہ تم خود ہی اس لڑکی کو راہ پر لاؤ....!“

”قیے لاؤں....!“ قاسم نے آہستہ سے پونچھا اور جلدی جلدی پلکیں جھپکائیں۔ پھر بولا۔

”اے کھاؤنا حمید بھائی، منہ باندھے کیوں بیٹھے ہو۔“

”کچھ نہیں! بس اب میں چلوں گا۔ مگر نہیں تم پہلے مجھے اپنا خیمہ دکھاؤ۔ تاکہ میں ان دونوں

کو وہیں لاؤں۔“

”وہ بوڑھا بھی آئے گا۔“ قاسم نے برا سامنے بنا کر پوچھا۔

”وہ نہ آئے گا تو لڑکی بھی نہیں آئے گی۔“

”پھر لاؤ.... سالے کو۔“ قاسم نے مردہ سی آواز میں کہا اور کسی سوچ میں پڑ گیا۔

میز کی اچھی طرح صفائی ہو جانے کے بعد قاسم اٹھا حمید کو ساتھ لے کر باہر آیا۔ یہاں سے

اس کا خیمہ زیادہ دور نہیں تھا۔

حمید اُسے خیمے میں چھوڑ کر خود اس چٹان کی طرف روانہ ہو گیا جہاں آصف اور زیبا ممکن

ہے کہ اس کے منتظر رہے ہوں۔

دفعتاً حمید کو شرارت سو جھی۔ اس نے سوچا کہ دونوں کی گفتگو چھپ کر سننی چاہئے۔ آخر وہ

تنہائی میں کس قسم کی گفتگو کرتے ہوں گے۔ کیا حقیقتاً زیبا اس کی بنائی ہوئی اسکیم ہی کے مطابق

چل رہی تھی یا اس کا یہ رویہ محض ہمدردی کی بناء پر تھا۔

وہ ڈھلوانی راستے پر اترتا چلا گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد زاویہ تبدیل کر کے مشرق کی جانب چل

پڑا اس کا خیال تھا کہ وہ دوسری طرف سے بھی اس چٹان کے محل وقوع کا اندازہ کر سکے گا۔ اس

لئے وہ بڑی لاپرواہی سے راستہ طے کر رہا تھا۔

لیکن پھر اچانک اس کے قدم رک گئے اور آواز ایسی ہی تھی۔ بالکل ایسا ہی معلوم ہوا تھا کہ وہ

کسی بہت بڑے اژدھے کی پھپکار رہی ہو۔

دفعتاً اس کی نگاہ نیچے وادی میں ریگ گئی۔ سینکڑوں فٹ کی گہرائی میں چاندنی کا چمکدار چشمہ

پھوٹ رہا تھا۔

”ٹھہرو۔“ دوسرے نے اپنے ساتھی کو خاموش کراتے ہوئے حمید سے نرم لہجے میں کہا۔
 ”یہ ممنوعہ علاقہ ہے۔“
 ”ہم یہاں کسی کو بھی گولی مار سکتے ہیں۔ ویسے اگر تم کمانڈر کے پاس چلنا چاہتے ہو تو ہم تمہیں
 وہیں لے چلیں گے۔“
 ”ارے ختم کر دو۔۔۔۔!“ دوسرا بولا۔

”نہیں کمانڈر کا حکم ہے کہ اگر کوئی ان کا حوالہ دے تو اُسے ان کے پاس پہنچا دیا جائے۔“
 ”تو پھر آخر یہ حکم میری یادداشت میں کیوں نہیں ہے۔“ دوسرا آدمی جھلا کر بولا۔
 ”چلو۔۔۔!“ پہلے نے راکفل کو جنبش دی اور پھر حمید نشیب میں اترنے لگا۔
 ”ٹھہرو۔۔۔!“ دوسرا بولا۔ ”اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“

حمید نے چپ چاپ تعمیل کی۔ دوسرا آدمی اس کی جامہ تلاشی لینے لگا۔ ریوالور تو حمید کی
 جیب میں موجود تھا۔

”دیکھا۔۔۔!“ دوسرے نے فاتحانہ انداز میں کہنا پھر حمید سے بولا۔ ”کیا اس کا لائسنس ہے
 تمہارے پاس۔“

”میں تمہیں تھانے دار نہیں سمجھتا کہ اس سوال کا جواب دوں۔“
 ”چلو۔۔۔!“ پہلا غرایا اور حمید پھر چل پڑا۔۔۔۔ کچھ دور چل کر وہ اُسے ایک غار میں لے گئے
 جو زیادہ کشادہ نہیں تھا۔

اب حمید کو سوچنا پڑا کہ وہ اُسے یہاں کیوں لائے ہیں۔ کیونکہ یہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔
 ”بائیں جانب مڑ جاؤ۔“ حکمانہ لہجے میں کہا گیا۔ حمید بائیں جانب مڑا۔ یہ ایک تنگ سادر تھا
 جس سے ایک وقت میں صرف ایک ہی آدمی گزر سکتا تھا۔

حمید کی نارنجی تو پہلے ہی سے روشن تھی اب ان دونوں نے بھی اپنی نارنجیں روشن کر لیں اور
 وہ تینوں یکے بعد دیگرے اس درے میں داخل ہوئے۔ حمید گھٹن سی محسوس کر رہا تھا۔ لیکن جلد
 ہی پھر اُس نے اطمینان کی سانس لی کیونکہ اب وہ ایک بہت ہی کشادہ غار میں پہنچ گئے تھے۔

”رک جاؤ۔۔۔۔ اور نارنج بجھا دو۔“ اس سے کہا گیا اور ساتھ ہی راکفل کی نال اس کی کمر سے
 آگئی۔ غار میں اندھیرا ہو گیا اور اس نے دور ہوتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں۔ شاید ان میں

پھر یک بیک اس کی دھار اوپر اٹھی۔ اٹھتی چلی گئی۔۔۔۔ اور اندھیرے میں اس نے ایک
 چمکدار منارے کی شکل اختیار کر لی جو زمین و آسمان کو ملا رہا تھا۔ نیچے پھیلی ہوئی تاریکی میں اس
 چمکدار منارے کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔

”میرے خدا۔۔۔!“ حمید بڑبڑایا۔ ”یہ چاندنی کا دھواں ہے یا اندھیرے کی ڈاڑھی۔“
 ساتھ ہی وہ سوچ رہا تھا کہ یہ تو سو فیصد ہی راکٹ ہے ایسا راکٹ جو عموداً پرواز کرتا ہے۔۔۔۔
 اس نے جیب سے نارنج نکالی اور پھر اس کی روشنی نشیب میں کچھ دور تک پھیلتی چلی گئی۔
 حمید نے ایک طویل سانس لی اور سوچا کہ راستہ دشوار گزار تو نہیں معلوم ہوتا پھر کیوں نہ
 نیچے پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ وہ خیالات میں اس طرح کھو گیا تھا کہ قاسم سے کیا ہوا وعدہ بھی یاد
 نہ رہا۔

نارنج کی روشنی کا دائرہ گھٹتا ہوا اس کی رہنمائی کر رہا تھا اور پیر غیر ارادی طور پر نشیب میں
 لے جا رہے تھے۔ اس کی نظریں گہرائی میں پھیلنے والے چمکدار چشمے پر جمی ہوئی تھیں۔۔۔۔ مگر اس
 چمکدار چشمے کا ہر لمحہ بڑھتا ہوا پھیلاؤ اُسے بتا رہا تھا کہ وہ اندھا لٹ میں تبدیل کرتا جا رہا تھا۔

حمید کے ذہن میں اس وقت صرف یہی ایک خیال تھا کہ بس اب وہ اس چمکدار چشمے کے
 قریب پہنچنے ہی والا ہے۔ نہ اُسے وقت کا احساس رہ گیا تھا اور نہ فاصلے کا۔۔۔۔ بس وہ مشینی طور پر اترتا
 چلا جا رہا تھا۔

اچانک کسی نے قریب ہی سے کہا۔ ”ہالٹ۔۔۔۔ ہو کس دیر۔“
 ”فرینڈ۔۔۔۔!“ حمید کی زبان سے نکلا اور ساتھ ہی روشنی کا دائرہ بھی آواز کی سمت ریگ
 گیا۔ دو فوجی راکفلیں چھتیائے ہوئے ایک چٹان پر کھڑے نظر آئے۔

”وہیں ٹھہرو! نارنج مت بجھانا ورنہ فائر کر دیا جائے گا۔“ ان میں سے ایک نے چیخ کیا۔
 حمید وہیں رک گیا۔ وہ دونوں چھوٹی چھوٹی رکاوٹیں پھلانگتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گئے۔
 ”کون ہو تم۔۔۔۔!“ ان میں سے ایک نے گرج کر پوچھا۔

حمید کی دانست میں وہ سرحد کی حفاظتی چوکی ہی کے جوان ہو سکتے تھے۔
 ”میں کون ہوں! یہ میں تمہارے کمانڈر ہی کو بتا سکوں گا۔“ حمید نے جواب دیا۔
 ”اچھی بات ہے۔ ہم تمہیں گولی مار دیتے ہیں۔ مرنے کی وجہ بھی کمانڈر ہی کو بتا دیتا۔“

سے ایک کہیں جا رہا تھا۔۔۔ حمید چپ کھڑا رہا اور راکفل کی نال اس کی کمر سے جھپتی رہی کچھ دیر بعد پھر قدموں کی آہٹیں ہوئیں۔ غالباً دو آدمی تھے اور پھر یک بیک پورے غار میں روشنی پھیل گئی۔ یہ ایک چھوٹی سی فوجی سرچ لائٹ کی روشنی تھی۔ حمید کو فوجی جوان کے ساتھ ایک مفر آفیسر نظر آیا جس کے شانوں پر لگے ہوئے ستارے بتا رہے تھے کہ وہ کپتان کا عہدہ رکھتا ہے۔ دفعتاً اس آفیسر نے غرا کر کہا۔ ”یہاں کیوں لائے ہو وہیں ڈھیر کر دیا ہوتا۔“ اب تو حمید کو سچ سچ تاؤ آگیا۔

اجنبی کی آمد

حمید کو تاؤ آنے کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ جو کچھ نہ ہو جائے تھوڑا ہے وہ چند لمحے اس کیپٹن کو خوشنور نظروں سے گھورتا رہا پھر بولا۔ ”تم کیپٹن حمید آف سنٹرل انٹیلی جنس بیورو سے ہمکلام ہو۔“ ”اوہ۔۔۔!“ آفیسر نے سیٹی بجانے والے انداز میں اپنے ہونٹ سکڑے اور پھر یک بیک اپنے ماتحتوں کو دیکھ کر غرایا۔ ”اس کے ہاتھ پیر باندھ دو۔“

”تم ہوش میں ہو یا نہیں۔“ ”میں بالکل ہوش میں ہوں دوست۔۔۔!“ آفیسر مسکرایا۔ ”مجھے اطلاع مل چکی ہے کہ اس نام کا ایک فراڈ یہاں آ رہا ہے۔“

”جب تم بالکل ہوش میں نہیں ہو۔“ حمید بے ساختہ ہنس پڑا۔ ”اچھا چلو یہی بتا دو کہ یہ اطلاع تمہیں کہاں سے ملی تھی۔“

”اسی جگہ کے ایک آفیسر کرئل فریدی کی طرف سے۔“

حمید نے متحیرانہ انداز میں پلکیں جھپکائیں۔ آفیسر سنجیدہ تھا اور اس نے یہ بات پوری سنجیدگی سے کہی تھی۔

اس کے دونوں ماتحتوں نے جھپٹ کر حمید کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ حمید کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُسے کیا کرنا چاہئے۔ اس کا خیال تھا کہ ممکن ہے یہ بھی فریدی کی کسی اسکیم کا کوئی خاص مرحلہ ہو۔ مگر وہ جھنجھلاہٹ میں ضرور مبتلا ہو گیا تھا۔ آخر اُسے پہلے سے آگاہ کیوں نہیں کیا گیا

تھا۔ اب اگر وہ یہاں کسی قسم کی حماقت شروع کر دے تو فریدی صاحب کی وہ اسکیم کہاں ہوگی۔ اس کا دل تو چاہا مگر جائے ان فوجیوں سے لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش ہی رہ گیا۔ انہوں نے نہایت اطمینان سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھ کر اُسے ایک بڑے پتھر پر دھکیل دیا۔۔۔ بڑا وحشیانہ انداز تھا۔ حمید بال بال بچاؤ نہ اس کا سراپی پتھر سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا۔ وہ پتھر بے لڑھکتا ہوا اپنے بازو کے بل زمین پر آگرا۔

”اب تم دونوں اپنی جگہوں پر جاؤ۔۔۔!“ آفیسر نے ماتحتوں سے کہا اور وہ ایڑیوں پر گھوم کر غار سے نکل گئے۔

آفیسر ٹھٹھٹا ہوا حمید کے قریب آیا۔ چند لمحے کھڑا اُسے گھورتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔ ”کرئل فریدی کہاں ہے۔“

”جہاں سے اُس نے تمہیں اطلاع دی تھی۔“ حمید غرایا۔

”وہ خود کیوں نہیں آیا۔“

”کھیل کود سے نفرت ہے انہیں۔۔۔!“ حمید بولا۔

”میں تمہاری کھال اتار دوں گا ورنہ اُس کے نہ آنے کی وجہ بتاؤ۔“

”ضرور اتار دو۔“ دفعتاً کسی گوشے سے آواز آئی اور آفیسر اچھل کر آواز کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پھر یہی جملہ کسی دوسرے گوشے سے کہا گیا اور آفیسر مڑ کر اوہر دیکھنے لگا۔ حمید محسوس کر رہا تھا کہ یہی آواز متعدد اطراف سے آرہی ہے۔ لیکن آواز ایک ہی آدمی کی تھی۔

”تم کون ہو۔ سامنے آؤ۔۔۔!“ آفیسر گر جا۔

”تمہاری یہ آواز بھی پوری کی جائے گی۔۔۔!“ آواز آئی اور پھر اسی پتھر کی اوٹ سے ایک آدمی پھلانگ لگا کر سامنے آگیا جس پر حمید کو دھکیلا گیا تھا۔

بالکل ایسا ہی لگا تھا جیسے وہ اڑتا ہو اس آفیسر پر جا پڑا ہو۔ دونوں ہی زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ لیکن نووارد جلد ہی نہ صرف خود اٹھ گیا بلکہ گریبان سے پکڑ کر اُسے بھی اپنے ہی ساتھ کھینچتا چلا آیا۔ پھر آفیسر سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ اس کے جڑے پر نووارد کا گھونہ پڑا وہ لڑکھڑا کر دور جاگرا۔۔۔ لیکن پھر اٹھ کر نووارد پر جھپٹا۔

اس بار نووارد نے جھکائی دے کر اسے اپنی پشت پر لاد کر جو چننا ہے تو پھر وہ پچارہ صرف ہاتھ

پیر ہی مارتا رہ گیا۔ غالباً یہ اٹھنے کی کوشش تھی۔ چونکہ ذہن قابو میں نہیں رہ گیا تھا اس لئے اس ارادے کی انرجی لائینی قسم کی جسمانی حرکتوں میں صرف ہو رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ وہ ساکت ہی ہو گیا۔

حمید نے بھی اپنے ہاتھوں کو آزاد کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ اسی دوران میں وہ اجنبی بھی بیہوش آفیسر کو دیکھ کر کسی طرف غائب ہو گیا۔

”کیا وہ فریدی تھا؟“ حمید نے سوچا۔ ”لیکن اگر فریدی ہوتا تو اُسے وہیں کیوں چھوڑ گیا ہوتا۔“ کچھ دیر بعد اس نے قدموں کی آہٹ سنی اور پھر وہی اجنبی ایک گوشے میں کھڑا دکھائی دیا۔ مگر وہ حمید کی طرف سے بالکل بے پرواہ نظر آ رہا تھا۔

دفعۃً حمید نے کہا۔ ”ارے یار ذرا دو چار ہاتھ مجھے بھی جھاڑتے جاؤ کافی عرصے تک احسان مند رہوں گا۔“

وہ مسکرایا اور بولا۔ ”نہیں تمہیں آزاد کر سکتا ہوں بشرطیکہ تم اس بیہوش آدمی کو کچھ دور تک اپنی پشت پر لا دے چلنے کا وعدہ کرو۔“

”اس کے پورے خاندان کو....“ حمید سر ہلا کر بولا۔ ”پہلے تم میرے ہاتھ تو کھولو۔“

”اس نے آگے بڑھ کر حمید کے ہاتھ کھول دیے۔“

”کہاں لے چلو۔“ اس نے بیہوش آفیسر کے قریب پہنچ کر کہا۔

”اٹھاؤ تو....!“

حمید نے اُسے اپنی پشت پر لا دیا اور اجنبی کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ اپنے ہاتھوں پر سرچ لائٹ سنبھالے ہوئے تھا۔ ایک بار پھر حمید کو ویسے ہی تنگ درے سے گزرتا پڑا جیسے درے سے گزر کر وہ اس غار میں پہنچا تھا۔

مگر منزل زیادہ دور ثابت نہیں ہوئی۔ وہ جلد ہی ایک ایسے غار میں پہنچ گئے جہاں مختلف قسم کا سامان بکھرا پڑا تھا۔

”مے سے یہیں کہیں ڈال دو۔“ اجنبی نے کہا اور سعادتمند گدھوں کی طرح ایک طرف بیٹھ جاؤ۔“

”سبحان اللہ....!“ حمید بڑا سامنا بنا کر بولا۔ ”تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے آپ کو

پہنچایا ہی نہیں تھا۔“

”مگر میں اب بھی اپنی آواز کو قابو ہی میں رکھتا تو تمہارے فرشتے بھی نہ پہچان سکتے۔ زیادہ اڑنے کی کوشش مت کیا کرو۔“

تو یہ فریدی ہی تھا.... حمید سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اس کے علاوہ اور سوچتا بھی کیا۔ اُسے اور آصف کو قربانی کے بکروں کی شکل میں بطور ہر اول پہلے ہی روانہ کر دیا گیا تھا۔ فریدی بیہوش آدمی کو بنور دیکھ رہا تھا۔

”یہ کون ہے؟“ حمید نے پوچھا۔

”چوکی کے آفیسروں کے بھیس میں کوئی....؟“ فریدی نے کہا۔

”اور آپ اچانک یہاں کیسے پہنچ گئے۔“

”یہ بھی ایک قسم کا آسپی خلل ہے۔“ فریدی اپنی بائیں آنکھ دبا کر بولا۔

”ہوں! تو آپ کو سب کچھ معلوم ہے۔“

”صرف اتنا ہی کہ وہ کمرہ آسیب زدہ تھا جس میں تم لوگوں نے قدم بجالایا تھا وہاں تمہیں آوازیں سنائی دیتی تھیں۔“

”بس اتنا ہی یا اور کچھ بھی؟“

”اور کیا بتانا چاہتے ہو۔“ فریدی مسکرایا۔

”کیا آپ کی لسٹ پر کبھی کوئی کرئل وارڈ بھی رہا ہے۔“

”تھا تو نہیں مگر اب آگیا ہے۔ لیکن تم اس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہو۔“

”کیا آپ کو علم ہے کہ اس کے قبضے میں روہیں ہیں۔“

”ہاں سنا ہے۔“

”میں اور آصف اس کمرے میں کسی عورت کی آواز سنتے رہے تھے۔ پھر ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ فون پر میری ٹرنک کال ہے۔ میں سمجھا آپ ہوں گے لیکن فون میں بھی اسی عورت کی آواز سنائی

دی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی میں چرواہی ہوں اور انٹرنیشنل آرٹ ایگزیشن سے بول رہی ہوں؟“

”اوہ....!“ فریدی نے ہونٹ سکڑے اور حمید کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ پھر مسکرا کر

بولا۔ ”یہ ایک بڑا دلچسپ لطیفہ ہے۔ کسی وقت اطمینان سے بتاؤں گا۔ اسی چرواہی کی بدولت ہم

اتنی تیز رفتاری سے کسی خاص سمت بڑھ رہے ہیں ورنہ بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا۔“

حمید چند لمحے خاموش کھڑا رہا.... پھر بولا۔ ”کیا وہ دونوں سپاہی اس وقت وہاں میرے ہی منتظر تھے۔“

”نہیں.... وہ وہاں ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ کیونکہ وہی ایک راستہ ایسا ہے جس کے ذریعہ وادی تک پہنچنا ممکن ہے۔“

”تو یہ بھی محض اتفاق ہی تھا کہ میں وہاں پہنچ کر خواہ مخواہ نیچے اترنے لگا تھا۔“
 ”یہ اتفاق تمہیں دوسری دنیا میں بھی پہنچا سکتا تھا۔ مگر خیر.... میں تو سمجھا تھا شاید تمہارے ذہن میں وہی پرانی چھپکلی کلبلائی ہے۔ بہر حال میں تم سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔“

”اگر چھپکلی نہ کلبلائی تو آپ اس وقت یہاں نہ ہوتے.... اور یہ....!“ حمید بیہوش آدمی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ اور پھر چونک پڑا کیونکہ اس نے قدموں کی آہٹیں سنیں تھیں۔
 ”پرواہ نہ کرو۔“ فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”اگر یہ وردی میں ہوں گے تب بھی میرے ہی آدمی ہوں گے اور اگر نقابوں میں ہوئے تو پھر تم جانتے ہی ہو۔“
 ”بلیک فورس....!“ حمید نے برا سامنہ بنایا۔

غار میں داخل ہونے والے تین نقاب پوش ہی تھے۔ انہوں نے پہاڑی مہمائی استعمال کے لباس پہن رکھے تھے اور ان کی پٹیوں سے چھوٹی کدالیں اور دوسرے اوزار لٹک رہے تھے۔
 کاندھوں پر کئی قسم کے تھیلے بار تھے!

”شکار۔“ فریدی نے اپنی اصل آواز میں کہتے ہوئے بیہوش آدمی کی طرف اشارہ کیا۔
 ان میں سے ایک نے ایک بڑا تھیلا اپنے کاندھے سے اتارا اور دو آدمیوں نے اُسے اٹھا کر اس میں ٹھونس دیا۔ تھیلے کا منہ باندھ لینے کے بعد بھی وہ تینوں وہیں رکے رہے۔ غالباً انہیں اجازت کا انتظار تھا۔

”تم جا سکتے ہو۔“ فریدی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ان میں سے دو نے زنی تھیلا سنبھالا اور تیسرا ان کے آگے مارچ لئے ہوئے چلے لگا۔
 تھوڑی دیر بعد قدموں کی آوازیں سنائے میں تحلیل ہو گئیں اور فریدی ایک پتھر پر بیٹھ کر سگار سلگانے لگا۔

”آپ سگار پینے جا رہے ہیں۔ اگر فوجیوں میں سے کوئی آجائے تو۔“

”کیا مطلب....!“

”اوہ.... تم نہیں مانو گے۔ خیر ٹھہرو! پہلے مجھے کچھ معلوم کرنے دو۔ یہ بیہوش آدمی کسی کے میک اپ میں ہے اور شاید یہ جگہ ایسے ہی کاموں کے لئے مخصوص ہے۔ لہذا یہاں میک اپ کا سامان ضرور ہونا چاہئے۔“

حمید چپ چاپ کھڑا رہا اور فریدی ادھر ادھر بکھرے ہوئے سامان میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ آخر کار اُسے لکڑی کا وہ صندوق مل ہی گیا جس کی اُسے تلاش تھی۔ اس صندوق میں میک اپ کا سامان موجود تھا۔

بس پھر آدھے گھنٹے کے اندر ہی اندر بیہوش آدمی کی نقل تیار ہو گئی اس کے بعد فریدی ایک نیلے رنگ کی بوتل سنبھالے ہوئے بیہوش آدمی کی طرف متوجہ ہوا.... اس میں کوئی سیال چیز تھی۔ غالباً وہ بیہوش آدمی کا میک اپ ختم کرنے جا رہا تھا۔

ذرا ہی دیر میں حمید نے بیہوش آدمی کی شکل دیکھ لی.... یہ ایک وجیہ نوجوان تھا۔ بڑھاپے کے سارے مصنوعی آثار لکڑیڈ ایسویا سے دھل گئے تھے۔
 ”یہ کون ہو سکتا ہے۔“ حمید بڑبڑایا۔

”چرواہی کی کوئی بھیڑ۔“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”شاید حفاظتی چوکی کا کمانڈر بار ڈالا گیا۔ اچھا دیکھو تم اس درے سے نکلتے ہی بائیں جانب مڑ جانا۔ اس طرح تم پھر ایک درے میں داخل ہو گے وہ درہ تمہیں ایک کھلی جگہ پر لے جائے گا وہاں پہنچ کر تم تین بار اشارہ دینا اور پھر چپ چاپ واپس آ جانا۔“

”کون سا اشارہ....!“

”الو.... والا....!“

حمید درے کی طرف مڑ گیا۔ ایک منٹ کے اندر ہی اندر وہ کھلی فضا میں پہنچ گیا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کے جسم سے ٹکرائے اور اس کی آنکھوں میں نیند اگڑائیاں لینے لگی۔ کچھ عجیب سی محسوس کن فضا تھی۔ سر پر تاروں بھرا آسمان تھا اور نیچے تاریک گہرائیاں۔

اس نے تین بار اُلوی آوازیں نکالیں اور پھر درے میں مڑ گیا۔

اتنی دیر میں فریدی اس بیہوش آدمی کی وردی بھی چکا تھا۔

”گذا بہت اچھے.... تم اب سوچنے لگے ہو۔ لیکن یہ سگار اسی وردی کی جیب سے برآمد ہوا ہے گو کہ برانڈ میرا نہیں ہے.... لیکن پھر بھی چلے گا۔“

”ہاں.... آپ اس چرواہی کے متعلق کچھ بتاتے جا رہے تھے۔“

”اس کے متعلق کیا بتاؤں۔ اس کے متعلق میری معلومات بھی فی الحال آسیب کی حدود سے آگے نہیں بڑھیں۔“ فریدی نے اُسے جیلانی اور اس کی تصویر کے متعلق بتایا۔

”لیکن آپ نے اس تصویر میں اتنی دلچسپی کیوں لی تھی۔“

”شہرہ! تم نے کرئل وارڈ کے متعلق پوچھا تھا.... اُسی شخص نے جیلانی کی یہ تصویر خریدی ہے اور میں اسی کا تعاقب کرتا ہوا یہاں آیا ہوں۔“

”وہ کہاں ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”اوپر کسی خیمے میں....!“

”بڑی عجیب بات ہے۔“

”بڑی عجیب بات ہے.... جیلانی اس تصویر کو آسیب سمجھتا ہے اور وہی آسیب مجھ سے فون پر گفتگو کرتا ہے.... اور اسی آسیب کی آوازیں ہمیں فزارو کے ایک کمرے میں سنائی دیتی ہیں۔“

”کرہ کرئل وارڈ سے نسبت رکھتا ہے اور یہی کرئل وارڈ جیلانی کی تصویر خریدتا ہے....!“

”ہاں خریدتا ہے.... تو پھر....!“ اچانک وہ دونوں ہی اچھل پڑے.... پورا غار کسی نسوانی آواز سے گونج اٹھا تھا اور وہ دونوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔

آواز پھر آئی.... اس بار وہ ایک ٹھٹھکتا ہوا قہقہہ تھا۔ حمید نے آواز صاف پہچان لی۔ یہ وہی آواز تھی جو وہ فزارو کے کمرے میں سنتا رہا تھا۔ یہی آواز اس نے فون پر بھی سنی تھی۔

”یک بیک حمید سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر جھکا اور سیدھا کھڑا ہوتا ہوا بولا۔“ میرے لئے کیا حکم ہے جان بہار! کیا میں اس آدمی کی گردن اڑا دوں....!“

”کیپٹن حمید! تم جھوٹے ہو۔ تم اس آدمی کے لئے ساری دنیا میں آگ لگا سکتے ہو۔“

”روح بہار! تمہارے نغموں نے مجھے اس سے متنفر کر دیا ہے۔“

”احمق کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مجھے تمہاری اس ایکنگ پر یقین آگیا تھا۔“

”تمہاری آواز میں کتنا رس ہے....!“ حمید نے کہا۔

اس نے دیکھا کہ فریدی دبے پاؤں درے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے اُسے وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کیا تھا۔

”بکو اس مت کرو....!“ نسوانی آواز آئی۔

”کاش میں تمہیں دیکھ سکتا۔“

”کرئل فریدی سے پوچھو کہ میں کتنی دکش ہوں۔“

”مگر جیلانی تو کہتا ہے کہ اس نے تمہیں کبھی دیکھا ہی نہیں۔“

”نہیں.... لیکن روحانی طور پر وہ مجھ سے متاثر ہوا ہے کیا تمہیں یقین ہے کہ میں ایک روح ہوں۔“

”مجھے یقین ہے روح بہار.... کاش میں.... کاش میں.... بعض اوقات دل چاہتا ہے کہ تم ملو تو تمہیں اپنے دل میں چھپالوں.... اس وقت کوئی اچھا سا فلمی گیت سناؤ.... وہی.... ٹھک ٹھک ناچوں گی ہولے ہولے گاؤں گی.... ہائے!“

”کرئل کیوں خاموش ہے۔“

”وہ روح وغیرہ کا قائل نہیں ہے۔“ حمید نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ فریدی غار میں موجود نہیں تھا۔

”شاید وہ یہاں کسی ٹرانسمیٹر کی موجودگی کے امکان پر غور کر رہا ہے۔“

”ہو سکتا ہے.... روح بہار!.... مگر میں تو قائل ہوں تمہارا.... اگر مجھے تمہاری روح ہونے میں شبہ ہو تا تو فزارو کو الٹ کر رکھ دیتا مگر یہ تو بتاؤ کہ ابھی میں کس چکر میں بھنس گیا تھا۔“

”روحوں پر سب کچھ عیاں ہوتا ہے۔ لیکن انہیں کائنات کے راز بتانے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لئے میں تمہاری یہ آرزو نہیں پوری کر سکوں گی۔ ویسے میں اپنے دل میں تمہارے لئے کافی جگہ پاتی ہوں۔“

”روحیں بھی دل والی ہوتی ہیں....“ حمید نے حیرت سے پوچھا۔

”مجسم دل.... مگر نہیں تمہیں مجھ پر یقین کب ہے.... چلو تم یہاں کوئی ٹرانسمیٹر تلاش کرو۔“

”مجھے یقین ہے....!“

”نہیں اطمینان کر لو....!“

حمید نے چیزوں کو الٹا پلٹنا شروع کر دیا۔ مگر کہیں بھی اسے کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جس پر ٹرانسمیٹر ہونے کا شبہ بھی کیا جاسکتا۔

”میں خواہ مخواہ تھکنا نہیں چاہتا روح بہار....!“ حمید نے کہا۔ لیکن اب اس کی آواز نہ آئی۔

”روح بہار میں تم سے مخاطب ہوں۔“ حمید نے چیخ کر کہا۔

لیکن جب پھر نہ آئی.... خود اس کی آواز غار کی وسعتوں میں گونج کر رہ گئی۔

”آرڈر....!“ دفعتاً پشت سے ایک گرجدار آواز آئی اور حمید چونک کر مڑا۔ وہی دونوں فوجی

رائفلیں سیدھی کئے کھڑے تھے جو اسے یہاں لائے تھے۔

”کمانڈر کہاں ہیں۔“ ایک نے گرج کر پوچھا۔

”پتہ نہیں! مجھ سے تو یہ کہہ کر گئے ہیں کہ میں ذرا اپنی محبوبہ تک ایک پیغام پہنچا کر آتا ہوں۔“

”گھبرو.... مارو....!“ ایک نے دوسرے سے کہا اور وہ دونوں رائفلوں کے کندے اٹھائے

ہوئے اس کی طرف جھپٹے ہی تھے کہ درے سے فریدی برآمد ہوا۔

”ٹھہرو....!“ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ وہ مڑے اور پیچھے ہٹ گئے۔ لیکن پھر ایسا معلوم ہوا

جیسے وہاں زلزلہ سا آگیا ہو۔ چار نقاب پوش کسی طرف سے نکل کر فریدی پر ٹوٹ پڑے۔ فوجی دم

بخود کھڑے رہ گئے۔

”اور تم کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ کمانڈر کو بچاؤ۔“ حمید نے انہیں للکارا.... لیکن قبل

اس کے کہ وہ دونوں فوجی کوئی قدم اٹھاتے دو فائر ہوئے اور وہ دونوں وہیں ڈھیر ہو گئے۔

تو یہ جال بچھایا گیا تھا فریدی کو پکڑنے کے لئے۔ حمید نے سوچا اور اُن نقاب پوشوں پر پل پڑا

جو فریدی کو بے بس کر دینے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ ان فائروں کے متعلق سوچ رہا تھا آخر

وہ کدھر سے ہوئے تھے۔ کس نے کئے تھے۔

نقاب پوش فریدی سے چمٹنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ دفعتاً حمید نے محسوس کیا کہ

نقاب پوش اس میں دلچسپی نہیں لے رہے بلکہ وہ خواہ مخواہ ان سے بھڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔

دفعتاً فریدی کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی اور حمید بیساختہ چونک پڑا۔ یہ ایک قسم کا اشارہ

تھا جس کا مطلب وہ بخوبی سمجھتا تھا.... وہ چپ چاپ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹا اور لہرا کر فرش پر ڈھیر

ہو گیا۔ پھر لیٹے ہی لیٹے ایک پتھر اٹھایا اور سر ج لائٹ پر کھینچ مارا....

دوسرے ہی لمحے میں اندھیرا گھپ....!

اس نے بیک وقت کئی چیخیں سنیں۔ پھر بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں اور اب پھر پہلے

یہ جیسا سنا تھا.... حمید سینے کے بل ریگلتا ہوا درے کی طرف بڑھا۔

روح کے چکے

قاسم نے بڑی دیر تک حمید کا انتظار کیا.... جب اس کی واپسی ہوئی تو وہ خود ہی اٹھا اور اس کی

تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

مگر یہ ایک مشکل کام تھا کیونکہ چٹانیں تو دور دور تک آباد تھیں! اس نے سوچا کہ حمید کو

آوازیں دینا شروع کر دے.... مگر پھر بدل آگئی کہ یہاں تو درجنوں حمید ہوں گے! پتہ نہیں کتنے

دوڑے آئیں اور اُسے خواہ مخواہ ہر ایک سے معافی مانگنی پڑے۔ پھر کیا صورت اختیار کی جائے۔

فریدی والے حمید بھائی.... کیوں نہ پکارا جائے.... بس خیال آیا ہی تھا ذہن میں کہ اس

نے ہانک لگائی۔ ”اے فریدی والے حمید بھائی۔“

لیکن پھر بھی کسی کے کان پر جوں تک نہ ریٹنگی۔

ویسے کسی نے قریب ہی سے ضرور کہا تھا کہ دیکھنا ذرا ایسے ڈیل ڈول والوں کو بھی شراب

بالآخر شیشی ہی دیتی ہے۔

یہ الفاظ قاسم کے کانوں میں پڑے اور وہ بھنا کر رہ گیا۔ جی تو چاہا کہ سالے کو اٹھائے اور کسی

چٹان پر اس طرح شیخ وے کہ بھیجا بکھر جائے۔ مگر پھر اس لڑکی کا خیال آگیا جو حمید کے ساتھ تھی

اور وہ تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔

نارنج کی روشنی چاروں طرف ڈالتا جا رہا تھا۔ اچانک خود اس کے چہرے پر نارنج کی روشنی

پڑی اور اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

”اے قون ہے بے۔“ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دھاڑا۔

”حمید کو دیکھا ہے کہیں۔“ آنے والے نے قریب پہنچ کر پوچھا۔

”میں خود ہی ڈھونڈ رہا ہوں۔“

”آپ مسٹر قاسم ہیں شاید۔“

”جی ہاں.... جی ہاں.... پھر فرمائیے۔“

”حمید میرے ساتھ آیا تھا۔ بڑی دیر سے غائب ہے۔“

”آپ.... آفس صاحب ہیں نا....!“ قاسم نے پوچھا۔

”آصف....!“ آنے والے نے تصحیح کی۔

”جی ہاں.... جی ہاں.... میں آپ کو پہچانتا ہوں.... ابھی حمید بھائی ملے تھے کہا تھا کہ

سب کو لے کر آتا ہوں۔ پھر گائب ہو گئے.... جی ہاں.... میرے پاس بہت بڑا خیہ ہے.... ٹر

نے کہا کہ میں اکیلا ہوں.... پھر آپ لوگ چٹان پر کیوں.... جی ہاں.... پڑے رہیں۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہوگی جناب۔“ آصف نے خوش ہو کر کہا۔ ”مگر آپ کو ہماری وہ

سے تکلیف ہوگی۔“

”ابھی واہ.... تو کی نہیں.... میں تو آپ کا کھادام.... خادم ہوں.... جناب، واہ آپ

میرے بزرگ ہیں۔“

”بہت بہت شکریہ....!“

”اچھا چلئے.... آپ کا سامان واماں کہاں ہے۔“ قاسم نے بے چینی سے کہا۔



حمید ورے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اچانک اس نے اسی پراسرار عورت کی آواز سنی۔

”تم نے بہت بُرا کیا کیپٹن حمید....! دشمنوں نے فریدی کو قتل کر دیا۔ لیکن تم مجھے ہی دشمن

سمجھتے رہے.... اب عقل کے ناخن لو.... ٹھہرو.... یہیں ٹھہرو....!“

حمید نے کوئی جواب نہ دیا۔ جہاں تھا وہیں رک گیا۔

”بولو.... تم خاموش کیوں ہو.... کیا چلے گئے.... بولو.... تم مجھے قریب سے دیکھ سکو گے

میں آ رہی ہوں وہیں ٹھہرو۔“

حمید نے سوچا کہ وہ ابھی دھوکا کھا چکا ہے۔ اسی کی گفتگو نے انہیں وہاں الجھائے رکھا تھا وہ

وہ غار سے نکل گئے ہوتے۔ وہ پلٹ کر ان دونوں لاشوں کے قریب آیا اور ان کی کمریں ٹٹولنے لگا۔

ان کے ہولسروں میں ریوالتور موجود تھے اور بھرے ہوئے تھے۔ حمید نے دونوں ریوالتور نکال

لے اور پھر بڑی تیزی سے درے میں ریگ گیا۔ اپنی سانسوں کے علاوہ اور کسی قسم کی آواز اُسے

نہیں سنائی دے رہی تھی اور دل کی دھڑکنیں کھوپڑی میں دھمک پیدا کر رہی تھیں۔

دوسرے غار میں پہنچ کر وہ بھول گیا کہ اس کا دہانہ کس سمت تھا۔ اس کی نارنج تواب اس کے

پاس رہی نہیں تھی.... جیب میں دیا سلائی کی ڈبیہ البتہ موجود تھی لیکن اس نے اُسے بھی کام میں

لانا مناسب نہ سمجھا۔ بس ٹٹول کر آگے بڑھتا رہا۔

اچانک اس کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی.... کیونکہ وہ لڑھکتا ہوا نہ جانے کن

گہرائیوں کی طرف جا رہا تھا۔ اندھیرے میں جبکہ وہ گھٹنوں کے بل ریگ رہا تھا اُسے ایسا محسوس ہوا

تھا جیسے اس کے ہاتھوں کے نیچے زمین نکل گئی ہو اور وہ منہ کے بل کسی نامعلوم ڈھلان پر جا پڑا تھا۔

بس پھر وہ لڑھکتا ہی چلا گیا اُسے ہوش تھا اور اسکے حلق سے ڈری ڈری سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

”چھپاک....!“ وہ اچانک پانی میں جا پڑا جو بے حد سرد تھا۔ لیکن جب اس کے پیر تہہ سے

لگے تو جان میں جان آئی کیونکہ وہ سیدھا ہو کر سانس لے سکتا تھا۔ پانی کمر سے اونچا نہیں تھا۔ بہاؤ

میں بھی تیزی نہیں تھی۔

اس ”لڑھکاؤ“ میں اُسے کتنی چوٹیں آئی تھیں اس کا ہوش اسے نہیں تھا۔ وہ تو دراصل یہ

بادر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ زندہ ہی ہے۔

دفعتاً پھر اس کے حلق سے ایک بے ساختہ قسم کی چیخ نکلی.... مگر وہ توروشی تھی۔ تیز قسم کی

روشنی جو اچانک اس کے آس پاس پھیل گئی تھی.... نہ اس روشنی نے اسے کاٹا تھا اور نہ مارنے

وڈی تھی! پھر وہ چیخا کیوں تھا؟ حمید کو اپنی اس کمزوری پر غصہ آگیا۔ پھر اُسے احساس ہوا کہ وہ

دونوں ریوالتور اب بھی اس کے ہاتھوں میں دبے ہوئے ہیں۔

اُس نے اس روشنی میں چاروں طرف ایک اچلتی ہوئی سی نظر ڈالی لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ

روشنی کہاں سے آ رہی ہے۔

یہ ایک آٹھ یادس فٹ چوڑا درہ تھا جس کی پوری چوڑائی میں شفاف پانی بہہ رہا تھا۔

چند لمبے گذر جانے کے بعد حمید کو سچ مچ چوٹنا پڑا۔ کیونکہ اب یہ بات اچھی طرح اس کی

سمجھ میں آگئی تھی کہ وہ روشنی پانی کی سطح سے پھوٹ کر فضا میں منتشر ہو رہی تھی۔

یہ کیسی روشنی تھی؟ حمید کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”ارے باپ رے....!“ ایک بیک وہ بھڑک کر پیچھے ہٹا۔ اس کے بازوؤں کو کسی چیز نے لپٹا تھا اس طرح کہ وہ انہیں جنبش تک نہیں دے سکتا تھا۔

پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اس کے پیر پانی کی تہہ سے اکھڑ گئے اور وہ اوپر اٹھتا چلا گیا۔ اس بازوؤں کی ہڈیاں گویا ٹوٹی جا رہی تھیں وہ رسی کا پھندا ہی تھا جس نے بے خبری میں اُسے جکڑ لیا اور اب اُسے اوپر کھینچا جا رہا تھا۔

وہ غلاء میں جھول رہا تھا اور اوپر اٹھ رہا تھا۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ وہ چٹان سے ٹکراتے پچا۔ ہاتھ تو ہل ہی نہیں سکتے تھے ورنہ وہ ایسے مواقع پر انہیں روک بنانے کی کوشش کرتا.... جب بھی وہ جھکولا لیتا اس کی روح لرز اٹھتی کہ بس اب ٹکرائی کھوپڑی چٹان سے پیروں کو روک بنانے سے ڈرتا تھا۔ ایسا کرنے کے لئے اُسے سیدھا ہونے کی کوشش کرنی پڑتی لیکن اس سے خدشہ تھا کہ رسی کا پھندا بازوؤں میں پھسل کر گردن میں نہ آگئے۔



حمید کی بروقت غفلت کی بناء پر فریدی ان نقاب پوشوں کو ڈانچ دینے میں کامیاب ہوا تھا۔ درے سے نکل کر وہ کھلی فضا میں آگیا اور اب مشکل ہی تھا کہ وہ کسی کے ہاتھ آسکتا۔ نقاب پوش بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ فریدی دیر تک اندھیرے میں آنکھ پھاڑتا رہا۔ لیکن کوئی ہلکا سا سایہ بھی دکھائی نہ دیا۔

اب وہ حمید کے متعلق سوچ رہا تھا.... لیکن جس طرح ان دونوں فوجیوں کو گولی کا نشانہ بنایا گیا تھا اسی طرح ان دونوں کو بھی کیوں نہ ٹھکانے لگادیا گیا؟

وہ آخر انہیں زندہ کیوں پکڑنا چاہتے تھے؟.... کیا حمید ان کی گرفت میں آگیا ہو گا۔ اب وہ اُسے دانتھندی سے بعید سمجھتا تھا کہ دوبارہ اُس درے میں قدم رکھے۔ اُن لوگوں۔ درے سے باہر اُس کا تعاقب کیوں نہیں کیا حالانکہ تاروں کی چھاؤں میں وہ اُسے بہ آسانی دیکھ سکتے تھے اس طرح غائب ہو جانے کا یہی مطلب تھا کہ وہ غار میں اُس کی واپسی کی توقع نہ کرتے.... لیکن کس بناء پر....؟ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ انہوں نے حمید کو پکڑ لیا ہو! سوچ رہے ہوں کہ وہ اُسے تلاش کرنے ضرور آئے گا۔

وہ حمید کو قتل نہ کریں گے.... اس نے سوچا! اگر قتل ہی کرنا ہوتا تو دھوکے سے بھی

سکتے تھے۔ ان کے فرشتے بھی بچاؤ نہ کر سکتے۔ اس ہڑبوغ کا مقصد زندہ پکڑنا تھا اور اس مقصد کا جو کچھ بھی مقصد رہا ہو۔

وہ پھر اوپر چڑھنے لگا۔ راستہ دشوار گزار تھا اور معمولی ہی سی لغزش اُسے نیچے لے جاسکتی تھی.... دفعتاً اُسے اس نفلی کمانڈر کا خیال آیا۔ جسے بلیک فورس کے آدمی لے گئے تھے۔ پتہ نہیں ان پر کیا گزری ہو۔ وہ آدمی اب بھی ان کے قبضے میں ہو گیا نہیں۔ فریدی یہ سوچ کر چلتے چلتے رک گیا اور کوئی ایسی جگہ تلاش کرنے لگا جہاں بیٹھ کر سفری ٹرانسمیٹر پر اُن لوگوں سے رابطہ قائم کر سکے۔

وہ ایک ایسی جگہ پانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر اس نے کوٹ لی جیب سے سفری ٹرانسمیٹر نکالا جو ایک سو بیس سائز کے فولڈنگ کیمرے سے بڑا نہیں تھا۔

”ہیلو.... ہیلو.... بلیک.... ہارڈ اسٹون اسپیکنگ ہیلو.... بلیک....!“

دفعتاً ٹرانسمیٹر سے سوانی قہقہے کی آواز آئی جو غار والی آواز سے مختلف نہیں تھی۔

”کرئل.... کس پکڑ میں پڑے.... ہو....!“

”کیوں....!“ فریدی غرایا۔

”تم خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔“

”اوہو.... تو کیا میں نے ایسا کر کے غلطی کی ہے....؟“

”یقیناً! تم غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ میں صرف ایک روح ہوں اور اس وقت تمہیں چند اسمگلروں نے نچا کر رکھ دیا ہے۔ جسے تمہارے آدمی لے گئے ہیں وہ ایک اسمگلر تھا کمانڈر کو قتل کر کے اس کے بھیس میں چوکی کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا.... سارے سپاہی اُسے اپنا کمانڈر ہی سمجھتے تھے۔ اس وقت محض افشائے راز کے ڈر سے انہوں نے ان دونوں سپاہیوں کو گولی ماری.... سنو کرئل.... انہیں یقین ہو گیا ہے کہ تم اُن کے پیچھے ہو۔ لہذا وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ محتاط رہو۔“

”لیکن وہ ہیں کہاں....!“

”مجھ سے خوفزدہ ہو کر کسی طرف نکل بھاگے۔ ورنہ شاید اب تک تمہاری دھجیاں اڑ چکی

ہو تیں۔“

”کیا وہ حمید کو بھی لے گئے۔“

”نہیں وہ درے والے چشمے میں جا کر اٹھا۔ میں نے اُسے اوپر اٹھالیا ہے۔ اس وقت وہ در

والی چٹان پر بیہوش پڑا ہوا ہے۔“

”تم آخر کیا بلا ہو.....!“

”ایک روح جس نے جیلانی پر اپنا سایہ ڈال دیا تھا۔ کیا اس نے یہ نہیں بتایا کہ تین سال

وہ صرف میری تصویر بنا رہا ہے۔“

”میں روحوں کا قائل نہیں ہوں.....!“

”میں جانتی ہوں.....“ اُس نے کہا اور ایک زوردار قہقہہ لگا کر بولی۔ ”اسی لئے میں

تمہیں اس چکر میں ڈالا ہے تاکہ تم قائل ہو سکو! جب میں نے دیکھا کہ میری تصویر میں بہت زیادہ

دلچسپی لے رہے ہو تو میں نے ایک ماہر روحانیت کو مجبور کیا کہ اس تصویر کو ہر قیمت پر خریدے

کرئل وارڈ کے پیچھے لگ گئے۔ یہی میں بھی چاہتی تھی۔“

”کیوں.....؟“

”تمہیں روحوں کو قائل کرنے کے لئے..... اب تم دیکھو گے کہ تمہیں یقین و تشکیک

کتنے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور تم روحوں کے قائل کیسے نہیں ہوتے۔“

”تمہیں ان سمگلروں کے مقابلے میں ہم سے کیوں ہمدردی ہے۔“

”میں تم دونوں کو بے حد پسند کرتی ہوں! تم بہادر ذہین اور عالی ہمت ہو!“

”تم اس چمکدار اور متحرک منارے کو راکٹ کی گیس سمجھتے ہو۔“ عورت کی آواز آئی۔

”تم دلوں کی باتیں بھی جانتی ہو۔“ فریدی کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”یقیناً.....!“

”پھر وہ منارہ..... کیا بلا ہے۔“

”وہ میری بے تاب ہے..... میری بے چینی ہے..... جو زمین کا سینہ توڑتی ہوئی آسمان تک

جاتی ہے۔“

”اور ایک رومانی نظم تیار ہو جاتی ہے۔“ فریدی نے زہریلی جی ہنسی کے ساتھ کہا۔

”خیر بھگتو گے اپنی بے یقینی کو..... میں نے تمہیں آگاہ کر دیا۔“

”آخر تم چاہتی کیا ہو؟ روحوں کو ہم سے کیا سروکار.....!“

”میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم میرے سکون میں خلل انداز نہ ہو۔“

”میں ایک روح کا کیا گاڑ سکتا ہوں۔“

”یہاں سے چلے جاؤ۔“

”یہ بھی لایینی اور فضول سی بات ہے! آخر میں کیوں چلا جاؤں۔ مجھے دیکھنے دو کہ کرئل وارڈ

نے تمہاری تصویر کیوں خریدی تھی۔“

”تمہاری بے یقینی برقرار ہی رہے گی کیوں؟“

”آہا! وہ تو تم ابھی بتا ہی چکی ہو کہ مجھے سبق دینے اور میری بے یقینی دور کرنے کے لئے تم

نے وہ تصویر اُس سے خریدوائی تھی۔“

”تمہیں مجھ پر یقین کرنا ہی پڑے گا..... ختم کرو! اب تم اپنے آدمیوں سے گفتگو کر سکتے ہو۔“

”ٹھہرو.....!“ فریدی نے کہا۔ ”تم ایک روح ہو۔ تمہیں دل کی باتیں بھی معلوم ہو جاتی

ہیں۔ ذرا یہی بتاؤ کہ اس سمگلر پر کیا گزری جسے میرے آدمی لے گئے ہیں۔“

”وہ تھیلے میں گھٹ کر مر گیا۔ تمہیں اپنے ساتھیوں کے نام اور پتے نہیں بتا سکے گا۔“

”تمہیں یقین ہے.....!“ فریدی نے مسکرا کر پوچھا۔

”جاؤ..... حمید کی خبر لو..... وہ چشمے والے درے کی چٹان پر پڑا ہے۔ اس نے سرد پانی کے

غوطے کھائے تھے۔ کہیں اُسے نمونیہ نہ ہو جائے۔ اچھا اب میں تمہارے ٹرانسمیٹر پر سے اپنا سایہ

ہٹا رہی ہوں۔ اب تم اپنے بلیکیز سے گفتگو کر سکتے ہو۔“

ہلکی سی کھر کھر اہٹ کی آواز آئی اور پھر بلیک فورس کا کوئی آدمی بولا۔

”ہیلو..... ہیلو..... ہارڈ اسٹون پلیز..... ہارڈ اسٹون پلیز.....!“

”اسٹون اسپیکنگ.....!“ فریدی نے کہا۔

”دیکھئے! تھیلے سے اس کی لاش برآمد ہوئی ہے اور اس کا سارا جسم نیلا پڑ گیا۔ حتیٰ کہ دانت بھی

نیلے ہو گئے ہیں۔“

فریدی نے معنی خیز انداز میں سر ہلا کر کہا۔ ”اس کا پوسٹ مارٹم ضرور ہونا چاہئے۔ طریقہ یہ

ہو گا کہ لاش کو اسی وقت ٹیکم گڈھ لے جاؤ اور کسی شاہراہ پر ڈال دو۔ لیکن اس کی ذمہ داری بھی نہ
پر ہی ہو گی کہ اُسے پولیس کے علاوہ اور کوئی نہ اٹھانے پائے۔“
”مطمئن رہئے۔۔۔ ایسا ہی ہو گا۔“

”اور۔۔۔ اینڈ آل۔۔۔!“ فریدی نے کہا اور سوچ آف کرنے ہی جا رہا تھا کہ نسوانی تقریر
سنائی دیا۔

”اب تم زہر کے امکانات پر غور کرو گے کرنل فریدی۔“

”غور کرنے کی بُری عادت سے بھی نالاں ہوں۔“

”اُسے سانپ نے ڈس لیا ہے۔۔۔ ان پہاڑیوں میں کئی رنگوں والا سانپ پایا جاتا ہے جسے
شفق کہتے ہیں۔ وہ اتنا ہی زہریلا ہوتا ہے کہ دانت تک نیلے پڑ جاتے ہیں۔ تمہارے آدمی تھلا ایک
جگہ ڈال کر کمین گاہ کا راستہ تلاش کرنے لگے تھے۔ سانپ نے تھیلے کے اوپر ہی سے اُسے ڈس لیا
لاش کا پوسٹ مارٹم ضرور کر آؤ۔ میں خود اس کی نگرانی کروں گی کہ اُسے پولیس کے علاوہ اور کوئی
ہاتھ نہ لگائے۔۔۔ پائے۔۔۔ اوہ کرنل کیا تم حمید کی خبر نہیں لو گے۔۔۔ اُسے تمہاری مدد کی
ضرورت ہے، ورنہ ہو سکتا ہے کہ اس کے پیچھے سردی سے متاثر ہو جائیں۔“
آواز آنی بند ہو گئی اور فریدی نے سوچ آف کر دیا۔

اس نے آج دن ہی میں وہ درہ دیکھا تھا جس کی تہہ میں ایک سست رفتار چشمہ بہتا تھا۔ تقریباً
بیس یا پچیس منٹ کی جدوجہد کے بعد وہ اس کی اوپری چٹان تک پہنچا اور پھر چڑھ کر اس کی
آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کیونکہ حمید ایک کمبل میں لپٹا ہوا خزانے لے رہا تھا اور اس کے پیچھے
ایک آرام دہ گدا بچھا ہوا تھا۔

”حمید۔۔۔ حمید!“ فریدی نے اس کا شانہ ہلا کر آواز دیتے ہوئے نارچ بھجادی۔

”سونے دیجئے۔“ حمید نے منمنکا کر روٹ لی۔

فریدی نے کمبل کا گوشہ ہٹا کر دیکھا۔ حمید کے جسم پر وہ ایوننگ سوٹ نہیں تھا جس میں اس
نے اُسے کچھ دیر پہلے دیکھا تھا۔ اس کی بجائے سلکین سلپنگ سوٹ تھا۔۔۔ اس نے پھر حمید
جھنجھوڑا اور حمید بڑبڑاتا ہوا اٹھ بیٹھا پھر جھلا کر بولا۔ ”کھا جائیے مجھے۔۔۔ سونے بھی نہیں
دیتے۔۔۔ ارے باپ رے۔“

وہ ایک بیک اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ فریدی نے پھر نارچ روشن کی اور حمید اپنے بستر کو آنکھیں
پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ پھر فریدی کے ہاتھ سے نارچ لے کر درے کی طرف چھپا۔ نیچے روشنی ڈالی
تقریباً پالیس فٹ کی گہرائی میں پانی بہہ رہا تھا۔
”کیا میں بیہوش ہو جاؤں۔“ اس نے پلٹ کر فریدی سے پوچھا۔
”کیا قصہ ہے۔“

”ارے یہ بستر۔۔۔ میرا اپنا ہے۔۔۔ اور یہ سلپنگ سوٹ بھی! بھگا ہوا ایوننگ سوٹ نہ جانے
کہاں گیا۔۔۔ میرے خدا۔۔۔ میں غار سے پھسل کر اس درے کے چشمے میں جا پڑا تھا۔ پھر کسی نے
ری کے پھندے میں پھانس کر مجھے اوپر کھینچ لیا۔ اس کے بعد کا ہوش مجھے نہیں۔۔۔ اف فوہ
دونوں بازو! پھوڑے کی طرح دکھ رہے ہیں۔ کیا میں یقین کر لوں کہ وہ سچ کچھ کوئی روح ہے۔“
”فی الحال یقین کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

”وہ بیہوشی کے عالم میں میرا گلا گھونٹ سکتی تھی۔۔۔ لیکن یہ دیکھئے وہ دونوں ریوالور بھی
نکلے کے نیچے موجود ہیں، جو میرے ہاتھوں میں تھے! میرا بستر۔۔۔ میرا تکیہ۔۔۔ یہ سب کچھ
یہاں کیسے آیا۔۔۔ میرا بیگ ہوا سوٹ کہاں گیا۔ یہ سلپنگ سوٹ تو میرے سوٹ کیس میں تھا۔“
فریدی پیشانی پر ٹکلیں ڈالے کچھ سوچ رہا تھا۔

بھگا ہوا سوٹ

وہ ایک بہت ہی تیز چیخ تھی جس سے بیگم تنویر کی نیند اچٹ گئی تھی۔ اُن کی آنکھیں پوری
طرح کھلی ہوئی تھیں اور دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کانوں میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں اور
پیسے کی چیچھاہٹ سارے جسم میں محسوس ہو رہی تھی۔

کمرہ تاریک تھا۔ وہ روشنی بند کر کے سونے کی عادی تھی۔

بدقت تمام وہ اٹھیں اور ٹوٹتی ہوئی سوچ بورڈ تک پہنچیں! دوسرے ہی لمحہ میں کمرہ روشن
ہو گیا۔ مگر پھر وہ سوچ میں پڑ گئیں۔۔۔ ہو سکتا ہے وہ محض واہمہ رہا ہو۔ انہوں نے وہ آواز خواب
میں سنی ہو۔ کیونکہ اب تو چاروں طرف سناٹا ہی سناٹا تھا۔

مجھے یاد نہیں.....!“
 ”جیلانی.....“ وہ آہستہ سے بڑبڑائیں اور اپنی پیشانی رگڑنے لگیں۔ پھر بولیں۔ ”چلو اٹھو اندر چلیں..... میری تو آئی گئی عقل خطہ ہو رہی ہے! سمجھ میں نہیں آتا کہ جیلانی کے لئے کیا کروں.....!“

”وہ اُسے کیوں لے گئے ہیں آنٹی.....!“
 ”میں کیا بتا سکتی ہوں۔“ انہوں نے تشویش کن لہجے میں کہا۔
 صوفیہ کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اس طرح گھر کے اندر نہیں جانا چاہتی۔ لیکن پھر وہ بیگم تنویر کا حکم نہ ٹال سکی اور اندر آکر بیگم تنویر نے دوبارہ دروازہ بولٹ کر دیا۔
 ”چلو اوپر چلیں.....!“ انہوں نے صوفیہ سے کہا۔

”وہاں کیا رکھا ہے! وہ تو اُسے لے گئے.....!“ صوفیہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔
 کچھ دیر بعد بیگم تنویر اوپر جانے کے لئے زینے طے کر رہی تھیں اور صوفیہ ان کے پیچھے تھی جیلانی کے کمرے میں سے ایک کے علاوہ اُسے کہیں بھی کسی قسم کی ابتری نہ دکھائی دی۔
 ابتری صرف اس کمرے میں تھی جہاں جیلانی تصویریں بنایا کرتا تھا۔ یہاں کا سارا سامان الٹ پلٹ کر رکھ دیا گیا تھا۔ فرش پر چاروں طرف تصویریں بکھری پڑی تھیں۔
 ”تصویریں کیوں الٹی گئی ہیں۔“ صوفیہ نے حیرت سے کہا۔

”خدا بہتر جانتا ہے۔“ بیگم تنویر نے طویل سانس لے کر کہا۔ اُن کی آنکھوں میں الجھن کے آثار تھے۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر وہ پھر بولیں ”جیلانی بے حد پُر اسرار آدمی ہے۔ مگر کرل فریدی اس کی تصویر میں کیوں دلچسپی لے رہا ہے۔ تصویر بجائے خود پُر اسرار تھی۔ جیلانی کو اس وقت یہاں سے اس طرح لے جانے والے کون تھے۔ وہ اُسے کہاں لے گئے ہوں گے۔“
 ”میں کیا کروں.....!“ صوفیہ بڑبڑائی۔

”کیوں؟“ بیگم تنویر چونک کر اُسے گھورنے لگیں! ”میں کیا کروں کا کیا مطلب.....!“
 ”جج..... جی کچھ مطلب نہیں..... بس..... یعنی کہ.....!“ صوفیہ ہکا کر رہ گئی۔ لیکن بیگم تنویر اُسے گھورتی ہی رہیں۔
 ”کیوں؟ کیا تم کوئی حماقت کر بیٹھی ہو۔“

پھر بھی وہ احتیاطاً باہر نکل ہی آئیں۔ برآمدے میں روشنی تھی۔ دل دھک سے رہ گیا۔ کیونکہ صدر دروازہ کے دونوں پاٹ کھلے ہوئے تھے۔

جلد ہی انہوں نے اپنی حالت پر قابو پایا کیونکہ وہ ایک مضبوط دل کی عورت تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ بیرونی برآمدے میں صوفیہ کو بیہوش دیکھ کر انہیں چکر آگئے ہوں۔
 انہوں نے اُسے ہلایا جلیا لیکن اُس نے آنکھیں نہ کھولیں.....! اُن کے یہاں کوئی ملازم نہیں تھا۔ مجبوراً وہ خود ہی اندر آئیں اور پہلے تو انہوں نے چلی منزل کے سارے کمرے دیکھ ڈالے اور یہ اطمینان ہو جانے پر کہ ساری چیزیں اپنی جگہ ہی پر موجود ہیں انہوں نے گلاس میں پانی انڈیا اور پھر وہیں پہنچ گئیں جہاں صوفیہ بیہوش پڑی تھی۔

انہوں نے اُس کے منہ پر چھینے دیئے اور ایک پرانا اخبار جھلکتی رہیں۔ کچھ دیر بعد صوفیہ نے آنکھیں کھولیں۔ چند لمحے پلکیں جھپکاتی رہی اور پھر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔
 ”آنٹی.....!“ اُس کے حلق سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی اور پھر وہ بیگم تنویر سے چمٹی ہوئی کوا نغھے سے بچنے کی طرح کانپ رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے..... کیا بات ہے! کیونکر میرا دم نکالے دے رہی ہو۔“ بیگم تنویر بولیں۔

”وہ..... وہ اُسے لے گئے آنٹی.....!“

”کون کسے لے گئے۔“

”جیلانی کو۔“

”جیلانی کو.....!“ بیگم تنویر نے حیرت سے کہا! ”کون لے گئے۔“

”چار آدمی تھے جن کے چہروں پر نقائیں تھیں۔“

”کہاں لے گئے..... کیوں لے گئے..... کیسے لے گئے۔“ بیگم تنویر بوکھلا گئیں۔

”زبردستی لے گئے۔ یہاں صحن میں جیلانی ان سے لڑ گیا تھا۔ انہیں میں سے کسی نے اس کے سر پر کوئی وزنی چیز ماری اور وہ بیہوش ہو کر گر گیا۔ میں اُسی کی آواز پر جاگئی تھی۔ دروازہ کھلا ہی تھا میں یہاں برآمدے میں آگئی۔ جیلانی ان کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک آدمی میری طرف بھی بڑھا اور پھر اس نے مجھے حلق سے آواز نکالنے کی بھی مہلت نہ دی! وہ میرا گلا گھونٹ رہا تھا۔ اسی دوران میں میں نے جیلانی کو بھی گرتے دیکھا اس کے بعد کاہل

ہوا۔۔۔ اسی دن کو مٹی خالی کر دی۔ کرائے کے مکان میں رہنے لگا۔ ہے کوئی بیسویں صدی میں بھی ایسا۔۔۔ مجھے تو نہیں دکھائی دیتا۔“

بیگم تو یہ خاموش ہو گئیں اور صوفیہ چونک کر بوکھلائے ہوئے انداز میں اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

”تم رورہی ہو۔۔۔!“ بیگم تو یہ نے حیرت سے کہا۔

”جی۔۔۔ وہ نہیں۔۔۔ دیکھئے نیک آدمیوں کے قصے سن کر میرا دل بھر آتا ہے۔“

”مجھے کچھ کرنا چاہئے۔۔۔ کر تل فریدی کو فون کروں۔۔۔ کیا کروں۔“

”کر تل فریدی کہیں باہر گئے ہوئے ہیں! کل جیلانی نے انہیں فون کیا تھا گھر سے یہی جواب ملا تھا۔“

”پھر پولیس اسٹیشن فون کروں۔۔۔ ہاں۔۔۔ میرے خُلا۔۔۔ میں کتنی پریشان ہوں۔۔۔ وہ کتنا اچھا تھا۔۔۔ ایسا دل کڑھ رہا ہے جیسے اپنا ہی بچہ کھو گیا ہو۔“



اتنی سردی تو تھی ہی کہ صرف سلکین سلپنگ سوٹ میں رہنا ناممکن ہو جاتا۔ حمید نے کمر لٹا لیا اور گدا تہہ کر کے کاندھے پر ڈال لیا۔ اُسے یہ دیکھ کر اور بھی حیرت ہوئی کہ اس کے پیروں میں پھیکے ہوئے جوتے بھی نہیں ہیں! خشک سلپرز پیروں کے پاس پڑے ہوئے تھے۔ یہ بھی اس کے اپنے ہی تھے۔

”وہ درے والی چٹان سے اترنے لگے۔“

”آخر آپ کو اس آسیب پر کس عورت کا شبہ ہوا ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”آسیب۔۔۔ آسیب ہے اس پر کسی کا شبہ کیسے کیا جاسکتا ہے۔ ہم نے ابھی تک اُسے دیکھا تو نہیں ہے کہ اس پر کسی کا شبہ کیا جاسکے۔“

”وہ تصویر کس کی تھی۔“

دفعۃً۔۔۔ فریدی نے اس کا بازو پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔ ”نیچے دیکھ کر چلو ابھی ہڈیاں چور ہو جاتیں۔“ حمید نے نیچے دیکھا۔ ایک بڑا سا غار تھا پھر وہ اس سے کتر اکر نیچے اترنے لگے۔

نیچے پہنچ کر کچھ دور سطح زمین پر چلنا پڑتا اور پھر اس کے بعد چڑھائی شروع ہو جاتی جس سے گزر کر وہ سیاحوں کے خیموں تک پہنچتے۔

”جی نہیں تو۔۔۔ مگر کیا مطلب! میں نہیں سمجھی آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔“

”کچھ نہیں۔۔۔!“ بیگم تو یہ نے خشک لہجے میں کہا۔ ”کوئی نہیں جانتا کہ جیلانی کون ہے۔“

اس کے والدین کون تھے کہاں تھے۔“

”وہ تو خود کو سردانش کا بیٹا کہتا ہے۔“ صوفیہ بولی۔

”نہیں تم نہیں جانتیں۔ اس کی اصلیت سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ وہ تو کل ایک آرٹسٹ لیڈی شیلڈر پرن سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے مجھے جیلانی کے متعلق کچھ بتایا ہے! سردانش ایک اچھے مصور اور لاؤلڈر رئیس تھے۔ انہوں نے شادی ہی نہیں کی تھی۔ اپنی دولت عموماً فنکاروں اور فن پر صرف کرتے تھے۔ جیلانی ایک دن انہیں شہر کے کسی فٹ پاتھ پر ملا تھا وہ کولے سے فٹ پاتھ پر تصویریں بنا رہا تھا۔ اس وقت اس کی عمر پندرہ سال تھی وہ اسی طرح پیٹ پالتا تھا۔ فٹ پاتھوں پر کولے سے اوٹ پٹانگ تصویریں بنا کر لوگوں کو خوش کرتا تھا اور وہ اُسے پیسے دیتے تھے۔ گویا اس نے بھیک مانگنے کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ سردانش اُسے اپنے گھر لائے اور اُسے تعلیم و تربیت دینے لگے بچوں کی طرح پالا اور مرتے وقت جائیداد اسی کے نام لکھ گئے۔“

”اس کے باوجود بھی وہ کرائے کے مکان میں زندگی بسر کرتا ہے۔“ صوفیہ نے حیرت سے

پوچھا۔

”ہوں! جیلانی جیسا شریف آدمی ہونا بہت مشکل کام ہے۔۔۔ آج تک میری نظروں سے تو

ایسا کوئی دوسرا آدمی نہیں گزرا۔۔۔ سردانش لاؤلڈر ضرور تھے لیکن اس کے بعض قریبی اعزہ تو

تھے ہی جو ان کے بعد ان کی جائیداد کے وارث ہوتے! لیکن سردانش ان سے سخت متفرق تھے۔ اس

لئے انہوں نے ان کو اپنی جائیداد سے ایک حصہ بھی نہیں دیا۔۔۔ ان کے وہ عزیز مفلس تھے ان

کے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ جیلانی سے مقدمہ بازی کر کے جائیداد نکال لیتے۔ سردانش کی ایک

بیوہ عم زاد بھی تھی زیادہ تر حق اسی کو پہنچتا تھا۔ وہ بڑی تنگ دستی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ ایک دن

جھلاہٹ میں جیلانی پر چڑھ دوڑی۔ جیلانی کو جب یہ معلوم ہوا کہ سردانش نے اُسے جائیداد

کر اپنے اعزہ کی حق تلفی کی ہے تو اُسے بڑا دکھ ہوا۔۔۔ اور وہ چپ چاپ ساری جائیداد

دستبردار ہو گیا۔۔۔ دانش کی عم زاد نے بہت چاہا کہ وہ اپنی رہائش کیلئے سردانش ہی کا کوئی بچہ

منتخب کر لے یا اسی کو مٹھی میں مقیم رہے جس میں اب تک رہتا آیا تھا۔ لیکن جیلانی اس پر تیار

فریدی اب بھی سرحدی چوکی کے کمانڈر ہی کے میک اپ میں تھا۔
 ”اب تم کہاں جاؤ گے۔“ فریدی نے اس سے پوچھا۔ پھر ٹارچ کی روشنی میں گھڑی کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ”اف..... فوہ تین بج گئے۔“

”میرا خیال ہے کہ قاسم خود ہی تلاش کر کے ان دونوں کو خیمے میں لے گیا ہو گا۔“

”مگر یہ لڑکی کیوں ہے تمہارے ساتھ!“

”ارے اسی بچاری نے تو سہارا دیا تھا۔ ورنہ پتہ نہیں کہاں کہاں بھٹکتے پھرتے چھوڑی پیک ہٹ اسی نے دلویا تھا۔“

”مگر اس کے ساتھ آنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”یہ میرے آفیسر مسٹر آصف سے پوچھئے۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔ حمید نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ”اب میں اس وقت کہاں جاؤں گا۔“
 قاسم کے خیمے کے قریب پہنچ کر فریدی چلتے چلتے رک گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”مجھے ان فوجیوں کی لاشوں کا بھی انتظام کرنا ہے۔ تم جاؤ..... لیکن تمہیں تا اطلاع ثانی نہیں قیام کرنا ہے۔“

”معاف کیجئے گا۔ میں آج کل صرف آصف کا پابند ہوں۔“ حمید نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

”تم دونوں ہی میرے پابند ہو۔ میری اجازت کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔“

فریدی نے کہا اور تیزی سے نیچے اترتا چلا گیا۔

حمید نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور گدا زمین پر رکھ کر اسی پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ تمباکو کی خواہش

اُسے بے چین کر رہی تھی۔ وہ تھکن بھی محسوس کر رہا تھا۔ اسی لئے یہاں بیٹھ گیا تھا۔ ورنہ یہاں

بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔

دس منٹ بعد وہ پھر اٹھ کھڑا ہوا..... اب اس کا رخ قاسم کے خیمے کی طرف تھا۔



زیادہ دور نہیں چلنا پڑا..... خیموں کی بہتی میں کہیں کہیں اس وقت بھی روشنی نظر آ رہی

تھی۔ حمید قاسم کے خیمے کے پاس رک گیا۔

اندرونی روشنی تھی لیکن درکارہ گرا کر باندھ دیا گیا تھا۔

اندرونی قاسم کی بھرائی ہوئی سی آواز آ رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ زیبائی ہنسی بھی سن رہا تھا۔

قاسم شاید انہیں کوئی کہانی سنارہا تھا۔

”پردہ کھولو.....!“ حمید نے باہر سے ہانک لگائی اور قاسم ایک بیک خاموش ہو گیا اور پھر

تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا! ”قون.....!“

”تمہارا بچا فرعون..... پردہ کھولو.....!“

”آئے..... حمید بھائی.....!“ قاسم نے نعرہ لگایا۔ پھر ایسا معلوم ہونے لگا جیسے خیمے میں

زلزلہ آ گیا۔ وہ بُری طرح ہل رہا تھا۔ کیوں نہ ہلتا جبکہ قاسم خود ہی پردے کی رسیاں کھولنے کی

کوشش کر رہا تھا۔

پردہ کھلا اور ساتھ ہی قاسم کا منہ بھی کھل گیا کیونکہ حمید کھل اڑھے ہوئے تھا اور اس کے

کاندھے پر گدا بار تھا اور جسم پر شبِ خوابی کا لباس۔ آصف اور زیبا بھی اُسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

”یہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو۔“ دفعتاً آصف نے غصیلے لہجے میں کہا۔

حمید نے کوئی جواب دیئے بغیر گدا زمین پر پھیلا دیا اور اس پر بیٹھتا ہوا بولا۔ ”میرا خیال ہے

کہ ساڑھے تین بج رہے ہیں۔“

”میں تم سے کیا پوچھ رہا ہوں۔“ آصف نے لاکڑا۔

”اے تو آہستہ بولونا بڑے بھائی..... چنگھارنے کی کیا جرورت ہے۔“ قاسم نے سر ہلا کر

کہا۔ ”حمید بھائی ہیں۔ کوئی نئی سوچ بھی ہو گی۔“

”میرا سامان کہاں ہے۔“

”وہ ادھر.....!“ قاسم نے ایک گوشے میں اشارہ کیا۔

حمید اٹھ کر اپنے سوٹ کیس کے قریب آیا۔ بھیگا ہوا سوٹ اس پر موجود تھا اور قریب ہی

جوتے رکھے ہوئے تھے۔

”سامان یہاں پہنچانے کے بعد آپ لوگ کہیں کئے تھے؟“ حمید نے آصف سے پوچھا۔

”بیچارہ کواں نہ کرو۔“ آصف نے برا سامنہ بنا کر کہا۔ ”اگر نہ گئے ہوتے تو تم چپ چاپ یہ

سارا سامان کیسے نکال لے جاتے..... کہاں تھے اب تک۔“

”یہ میرا نہیں بلکہ روح بہار کا کرشمہ ہے۔“

”کیا مطلب.....!“

”میں اس منارے کو دیکھ کر نیچے اترنے لگا تھا۔ دفعتاً پیر پھسلا اور میں ایک چشمے میں جا کر اب جو نارچ روشن کی اور اوپر دیکھا تو دم نکل گیا کیونکہ یہ پانی ایک گہرے درے میں بہہ رہا تھا اور دونوں طرف چٹانیں کھڑی تھیں۔ میرا سر چکر گیا کیونکہ اب اوپر پہنچنے کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آ رہا تھا کچھ ہوش آیا تو محسوس کیا کہ جسم پر بھیکے ہوئے کپڑے بھی نہیں ہیں۔ بستر بھی میرا اپنا ہی تھا اور سلیپنگ سوٹ بھی۔“

”لو ٹڈوں کو ایسی غپ سنانا....!“ آصف بے اعتباری سے بولا۔

اور حمید نے لاپرواہی سے کہا۔ ”بیگیا ہوا سوٹ اور جوتے یہاں موجود ہیں۔“

زیبا آگے بڑھ کر دیکھنے لگی۔ قاسم اس طرح پلکیں جھپکا رہا تھا جیسے وہ کچھ سمجھائی نہ ہو۔

”قیا.... قصہ ہے حمید بھائی....!“ اس نے پوچھا۔

”مجھ پر آسیب کا سایہ ہو گیا ہے۔“ حمید نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”ارے باپ رے۔“ قاسم کا منہ پھیل گیا۔

”تمہیں نیند کب آئے گی۔“ آصف نے زیبا سے کہا۔ ”خود بھی جاگ رہی ہو اور دوسروں کو بھی جگا رہی ہو۔“

پھر وہ سب چپ چاپ لیٹ گئے۔ قاسم بھی خاموش ہو گیا تھا۔ پتہ نہیں ذہنی رو بہک گئی تھی یا آسیب کے نام پر اس کا دم ہی نکل گیا تھا۔

حمید تفریح کے موڈ میں نہیں تھا۔ نیند بھی غائب ہو گئی تھی اور اس وقت وہ صرف سوچنا چاہتا تھا۔ آخر فریدی نے اس آواز کے متعلق کیا نظریہ قائم کیا تھا؟ کیا وہ بھی اُسے آسیب ہی سمجھتا تھا۔ مگر نہیں! آسیب کیوں!.... اگر یہی بات ہوتی تو پہلے ہی سے اس تصویر کے پیچھے کیوں پڑتا۔ اس وقت تک اس آسیب کا وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے جیلانی کو تین سال سے پریشان کر رکھا ہو۔ لیکن فریدی کو اس کا علم کب تھا.... وہ تصویر تو اچانک اس کے سامنے آئی تھی اور وہ اس میں دلچسپی لینے لگا تھا.... اگر اُسے آسیب نہ سمجھا جائے تو پھر اس آواز کا مسئلہ کیسے حل ہو سکتا ہے، جو ہر جگہ سنی جاسکتی ہے۔

حمید نے اس غار میں ٹرانسمیٹر تلاش کیا تھا۔ لیکن وہاں تو کوئی ایسی چیز بھی نہیں ملی تھی جس پر ٹرانسمیٹر کا شبہ ہی کیا جاتا۔ ”اوہ.... مگر....!“ وہ بوڑھلا.... اُسے تاریک وادی کی وہ سنہری

اسفنج نما کائی یاد آگئی جسے زیرولینڈ والے ٹرانسمیٹر کی بجائے استعمال کرتے تھے۔ اگر ویسا ہی کوئی سنہرہ ڈھیر کہیں چھپا دیا جائے تو اس سے بھی ویسی ہی آواز نکلے گی.... ”اوہ.... اوہ....!“ وہ مضطربانہ انداز میں اٹھ بیٹھا مگر فرار واک کرہ.... اس کے ذہن میں کانٹے سے چھبے لگے.... فرار و والا کرہ.... وہ اور آصف دونوں ہی اُسی کمرے میں موجود تھے! لیکن الگ-الگ اُس پر اسرار عورت کی آوازیں سن رہے تھے۔ جب وہ آصف سے مخاطب ہوتی تھی تو حمید اس کی آواز نہیں سن سکتا تھا اور جب وہ حمید سے کچھ کہتی تھی تو آصف نہیں سن سکتا تھا.... پھر اسے کیا کہا جائے گا.... ہو سکتا ہے اس بار فریدی کے نظریات شکست ہو جائیں.... مگر وہ چمکدار دھوئیں کا منارہ.... اس نے کہا تھا کہ وہ اس کی بے چینی تھی۔ فریدی نے تو یہی بتایا تھا۔ وہ اس کی بے چینی تھی جو زمین و آسمان کو ایک کر دیتی تھی۔ کتنا شاعرانہ خیال تھا.... وہ کیسی ہوگی.... کیسی ہوگی.... اس کی آواز کتنی ریلی ہے.... کتنی پُر اسرار ہے.... حمید بستر سے اٹھ گیا.... وہ لوگ خراٹے لینے لگے تھے مگر خیمے میں ٹپٹنے کی جگہ کہاں تھی.... پھر وہ کیا کرتا.... دفعتاً باہر سے آواز آئی۔

”کیٹین حمید.... براہ کرم باہر تشریف لائیے۔“

آواز مردانہ تھی اور حمید کے لئے بالکل نئی! ذہن پر زور دینے کے باوجود بھی وہ اس آواز کی شناخت نہ کر سکا۔

”کون ہے....!“ حمید نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”کرئل وارڈ....!“ پر سکون لہجے میں جواب دیا گیا اور حمید بے ساختہ اچھل پڑا۔ سونے والے سوتے رہے۔ حمید نے خیمے کے پردے کی رسیاں کھولیں پردہ ہٹاتے ہی پیٹرو میکسن کی روشنی کرئل وارڈ پر پڑی۔ وہ سفید سمور کی ٹوپی اور سیاہ لمبا دے میں لمبوس تھا۔

”شاید ہم پہلے کبھی نہیں ملے۔“ حمید نے کہا۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیا آپ میرے خیمے تک چل سکیں گے....!“ کرئل نے جھکیوں کے سے انداز میں کہا۔

”ضرور چلوں گا....!“ حمید نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

کھوپڑی کھاگئی

دلواسکتے ہیں۔“
”یہ زبان جو قینچی کی طرح چل رہی ہے منہ سے کھینچی بھی جاسکتی ہے۔“ حمید نے ناخوشگوار

لہجے میں کہا۔

دفعۂ زمین پر رکھی ہوئی کھوپڑی سے قہقہے کی آواز آئی اور یہ آواز اس آسیب کے علاوہ اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر اس نے حمید کو مخاطب کیا۔

”تم بڑے احسان فراموش معلوم ہوتے ہو۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے میں نے تمہاری جان بچائی تھی اور اب تم میرے پجاری کو آنکھیں دکھا رہے ہو۔۔۔۔!“

”ہیں۔۔۔۔۔ یہ تمہارے پجاری ہیں۔۔۔۔۔ روح بہار۔۔۔۔۔!“
”میرا پجاری۔۔۔۔۔!“ بڑی شان سے جواب دیا گیا۔

حمید کرئل وارڈ کی طرف مڑا اور اس سے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کرتا ہوا بولا۔ ”مجھے افسوس ہے مائی ڈیئر مسٹر پجاری۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تمہارا تعلق جان سے پیاری روح بہار سے ہے۔۔۔۔۔ ڈارلنگ روح بہار۔۔۔۔۔ اس غلطی پر تم جو سزا مجھے چاہو دے سکتی ہو۔ کہو تو مرغا بن جاؤں۔“

”مکاری کی باتیں نہیں کیپٹن حمید! میں نے تم سے بھی بڑے مکار دیکھے ہیں۔“

”جان آرزو! تم میرے خلوص کو پھانسی دے رہی ہو۔ میری دل آزاری نہ کرو۔ میں تمہارے لئے جان بھی دے سکتا ہوں۔“

”خیر اسی وقت اس کا بھی امتحان ہو جائے گا۔“ کھوپڑی سے آواز آئی۔ ”فی الحال میں تمہاری ایک آرزو پوری کرنا چاہتی ہوں۔ تم نے کہا تھا کہ تم مجھے دیکھنا چاہتے ہو۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔۔!“ حمید دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر دوڑا نو بیٹھ گیا اور بولا۔ ”تم میری خواہش پوری کرو گی۔۔۔۔۔ مگر کہاں۔“

”یہیں۔۔۔۔۔ اسی جگہ۔۔۔۔۔!“ کھوپڑی سے آواز آئی۔

”میں بہت مضطرب ہوں۔۔۔۔۔ روح بہار۔۔۔۔۔ اب باتوں میں وقت نہ برباد کرو۔“

”اچھا تو دیکھو۔۔۔۔۔!“ کھوپڑی سے آواز آئی اور یکایک خیمے میں اندھیرا گھپ ہو گیا! پٹرو میکس لیپ بجھ گیا تھا۔

پھر اس اندھیرے میں ایک جگہ روشنی کا دھبہ سا نظر آیا۔ کچھ دیر بعد جب آنکھیں

کرئل وارڈ کا خیمہ کیا تھا اچھا خاصا بھوت خانہ تھا۔ خیمے کے وسط میں ایک ایسا قالین بچھا ہوا تھا جس پر انسانی ہڈیوں کے ڈھانچوں سے ترتیب دیئے ہوئے ڈیزائن تھے۔ اسی قالین پر ایک جگہ انسانی کھوپڑی رکھی ہوئی تھی۔

حمید نے خیمے کی فضا میں عجیب سی بو محسوس کی۔ لیکن وہ اُسے کوئی معنی نہ پہناسکا۔ ویسے اس کا مبہم سا احساس ضرور تھا کہ وہ خوشبو کسی حد تک جانی پہچانی ہوئی سی ہے۔ پھر یک بیک اُسے یاد آگیا کہ وہ خوشبو کیسی ہے۔ ایسے خوشبو تو کفن سے آتی ہے۔ کافور صندل اور عطر کی ملی جلی خوشبو! کرئل وارڈ خیمے کے وسط میں کھڑا کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ویران ہوتی جا رہی تھیں۔۔۔۔۔ دفعۂ اس نے کہا۔ ”کیپٹن یہ میری زندگی کا حیرت انگیز ترین دن ہے۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“ حمید چونک پڑا۔

”اب تک میرے پاس ایسے ہی آدمی آتے رہے ہیں جنہیں کسی روح کو طلب کرنا ہوتا ہے۔ لیکن آج ایک ایسا آدمی آیا ہے جسے ایک روح نے طلب کیا ہے۔ میرے سارے کیرئیر میں ایک دن بھی ایسا نہیں آیا۔“

”مجھے کس روح نے طلب کیا ہے۔“ حمید نے متحیرانہ انداز میں پلکیں چھپکائیں۔

”تم کون ہو۔“

”کرئل وارڈ ماہر روحانیت کا نام شاید آپ نے پہلے بھی کبھی سنا ہو۔“

”مجھے یاد نہیں پڑتا۔“

”خیر ہوگا۔ تو ہاں آپ نے اس روح کے متعلق پوچھا تھا۔ وہ ایک قدیم روح ہے۔ بہت دنوں سے بے چین ہے۔ میں اس بے چینی کی وجہ نہیں جانتا۔ لیکن میرا علم ہی خبر دیتا ہے کہ عنقریب وہ روح سکون پا جائے گی۔“

”آپ جانتے ہیں میں کون ہوں۔“ حمید اپنا اوپری ہونٹ بھیج کر بولا۔ ”اور میرا وقت برباد کرانے کی سزا کیا ہو سکتی ہے۔“

”میں جانتا ہوں کہ آپ محکمہ سراغ رسانی کے ایک ذمہ دار آفیسر ہیں اور مجھے پھانسی تک

اندھیرے کی عادی ہو گئیں تو وہی دھبہ پہلے ہی سے بھی زیادہ واضح ہو گیا۔ یہ قالین کے وسط میں رکھی ہوئی کھوپڑی تھی۔ آنکھوں کے سوراخ پہلے ہی کی طرح تاریک تھے۔ کھوپڑی ہی کی طرح چمک رہی تھی۔ اچانک آنکھوں کے سوراخوں سے دوبار ایک چمکدار سی لکیریں نکلیں اور انہوں نے کھوپڑی کے گرد تقریباً پانچ فٹ قطر کا دائرہ بنایا۔ آہستہ آہستہ یہ دائرہ بلند ہونے لگا۔ چمکیلا غبار دائرے کی شکل میں اوپر اٹھ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ خیمے کی چھت سے جالگہ وہ غبار اتار وشن تھا کہ خیمے کی ایک ایک چیز صاف دیکھی جاسکتی تھی۔ حمید کے قریب ہی کرمل وارڈ کھڑا اس غبار کو بگھور رہا تھا۔ سفید سمور کی ٹوپی کے نیچے اس کا نیم تاریک چہرہ اس وقت بڑا بھیانک لگ رہا تھا۔ حمید کی آنکھیں اس کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔

پھر وہ چمکناہٹوں اور دھول کی مدھم آواز چمکدار غبار کے گولے سے نکل کر نیچے میں منتشر ہو رہی تھی۔ ایک عجیب سا نغمہ تھا۔ جس نے چند ہی لمحات میں ہزاروں سال پہلے کی دنیا کا ماحول پیدا کر دیا۔ عود و عنبر کی لپٹوں سے سارا خیمہ مہک رہا تھا۔ آہستہ آہستہ شہنائیوں کی آوازیں سکوت میں گم ہوتی چلی گئیں پھر گھٹنے بجتے لگے۔ بالکل ایسے ہی جیسے پوہ کے وقت بجتے ہیں۔ اس کے بعد کھینوں کی سی جھنناہٹ سنائی دی جو بتدریج بلند ہوتی گئی اور اب حمید کی سمجھ میں آیا کہ یہ ہزاروں آدمیوں کا کورس تھا۔ ہزاروں آدمی بیک وقت گارہے تھے۔ یہ حمید کی سمجھ میں نہ آسکا۔ موسیقی بھی غیر مانوس تھی۔ مگر اس سے عظمت اور جلال و جبروت کا اظہار ہو رہا تھا۔

پھر ایک بیک اس روشن غبار کے گولے کے اندر ایک دھندلا سا انسانی مجسمہ نظر آیا جس کے خدو خال واضح نہیں تھے۔ آہستہ آہستہ مجسمہ واضح ہوتا گیا۔ یہ ایک بے حد حسین عورت تھی۔ اس کے جسم پر قدیم یونانی وضع کا سفید لبادہ تھا اور وہ یونان ہی کی کوئی اساطیری دیوی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے ہونٹ ہلے اور آواز نکلی۔ یہی آواز حمید بہت دنوں سے سنتا آرہا تھا۔ مگر اس وقت جو کچھ بھی کہہ رہی تھی حمید کے فرشتے بھی اس کا مفہوم نہیں سمجھ سکتے تھے۔ پتہ نہیں وہ کون سی زبان تھی۔

پھر اچانک وہ ہنس پڑی۔ بالکل ایسا ہی معلوم ہوا جیسے چینی کی پلیٹ میں ننھے ننھے ٹھون مویوں کی لڑی ٹوٹ گئی ہو۔

”ہاں... تم نہیں سمجھے کیپٹن حمید۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے ابھی تمہیں دیوتاؤں کی زبان میں مخاطب کیا تھا۔ میں یونان کی وینس ہوں۔ اگر تم نے میرا بت دیکھا ہو تو پہچاننے کی کوشش کرو۔“ حمید کچھ نہ بولا۔ اس کے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ چھوٹ رہا تھا۔

”میں ہزار ہا سال سے نیکراں غلاؤں میں موجود ہوں۔!“ جس نے کہا۔ ”ہر دور میں مجھے چند لوگ پسند آتے ہیں۔ مجھے کرمل فریدی کی جرأت اور ذہانت پسند ہے۔ اور تم۔۔۔ تمہاری باغ و بہار طبیعت مجھے بھائی ہے۔۔۔ بلاؤ کرمل کہاں ہے وہ روحوں پر یقین نہیں رکھتا۔۔۔ تم ہی بتاؤ۔۔۔ تم جو ابھی سوچ رہے تھے کہ اس کھوپڑی میں کوئی چھوٹا سا ٹرانسمیٹر موجود ہے۔۔۔ تم جو تاریک وادی میں سنہری کائی دیکھ چکے ہو! مجھے بھی سائنس کا کوئی شعبہ سمجھتے ہو۔۔۔ بولو۔۔۔“

جواب دو! کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں۔“ حمید دم بخود تھا۔ وہ روشن غبار کے گولے کے درمیان اُس عورت کو دیکھ رہا تھا جس کا جسم حرکت کر سکتا تھا۔ جس کے متحرک ہونٹوں سے منتشر ہونے والے الفاظ اس کے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ وہ ایک روح تھی۔ کیا حقیقتاً وہ ایک روح تھی۔۔۔ حمید خائف نہیں تھا۔ لیکن اس کے اعصاب کو کیا ہو گیا تھا۔ اس کی زبان کیوں گنگ ہو گئی تھی۔

”تم اب بھی شے میں مبتلا ہو کیپٹن حمید۔ اچھا اٹھو اور میرے قریب آؤ۔۔۔ آؤ۔۔۔ ڈرتے کیوں ہو۔۔۔ کیا میں تمہیں کوئی گزند پہنچاؤں گی۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں کیپٹن حمید۔۔۔ اگر یہی چاہتی تو تم اس چشمے سے نکل کر بستر میں آرام کرتے ہوئے نہ پائے گئے ہوتے۔۔۔ آؤ قریب آؤ۔“

حمید ابھی تک دوڑا تو ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ بہت بڑی بزدلی ہوگی اگر وہ اٹھ کر اس کے پاس نہ جائے۔ وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا روشن غبار کے گولے کے قریب پہنچ گیا جو ایک ہی جگہ پر بڑی تیزی سے گردش کر رہا تھا۔

”تم واقعی بہت دلیر ہو کیپٹن حمید۔“ روح مسکرائی۔ ”تم جیسے لوگ بھی کم ہی دیکھنے میں آئے ہیں۔ اور دیکھو ذرا کرمل وارڈ کی حالت دیکھو۔“

حمید کرمل وارڈ کی طرف مڑا جو زمین پر اوندھا پڑا ہوا تھا اور اس میں زندگی کے آثار نہیں پائے جاتے تھے۔

”آؤ.... اندر آجاؤ.... ڈرو نہیں....!“ روح نے بڑے پیار سے کہا۔

حمید جی کڑا کر کے غبار کے گولے میں داخل ہو گیا.... روح اب اس سے صرف ایک فز کے فاصلے پر تھی!

”تو.... میرا ہاتھ پکڑ لو.... دیکھو کتنا سرد ہے.... شاید تمہارا زندگی سے بھرپور ہاتھ اسے کچھ حرارت دے سکے۔“ اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

وہ کتنی حسین تھی.... کتنی دلکش تھی.... حمید پر بے خودی سی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے چھپاک سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لیکن پھر اس کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی.... کیونکہ اس کی مٹھی بند ہو گئی تھی۔ بالکل ایسا ہی معلوم ہوا تھا جیسے وہ دھوئیں کا ہاتھ ہو۔ روح اب بھی وہیں موجود تھی اس کا ہاتھ بھی اسی پوزیشن میں تھا۔ حمید نے سنبھالا لیا.... اور جی کڑا کر کے اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا.... لیکن ہاتھ اس طرح اس کی کمر سے گزر گیا جیسے دھوئیں سے گزرا ہو۔

روح نے قہقہہ لگایا اور حمید لڑکھڑاتا ہوا.... روشن غبار کے گولے سے نکل آیا۔ اس کا مہر شدت سے چکر ا رہا تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اب وہ اپنی قوت سے کھڑا نہ رہ سکے گا۔

”دیکھا تم نے.... اب اپنا وقت برباد نہ کرو....!“ روح نے کہا اور آہستہ آہستہ اُسی روشن غبار میں تحلیل ہو گئی۔

پھر غبار بھی تاریکی میں مدغم ہو گیا۔ حمید وہیں کھڑا رہا۔ لیکن اب اس کی حالت اور زیادہ اتر ہوتی جا رہی تھی۔

وہ کیا کرے.... وہ کیا کرے.... اتنی سی بات بھی اس کی سمجھ میں نہ آسکی کہ اُسے بیٹھ جانا چاہئے وہ آگے پیچھے جھول رہا تھا.... دفعتاً کرل وارڈ اٹھ کر اس کی طرف جھپٹا اور دانے باز کا سہارا دیتا ہوا بولا۔ ”سنبھلو کیپٹن.... سنبھلو.... میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں کہ آج تمہارا بدولت اس کا دیدار نصیب ہوا.... ورنہ میں برس سے اس کی پرستش کرتا آرہا تھا۔ مگر وہ کبھی میرے سامنے نہیں آئی.... صرف اس کی آواز ہی سنتا رہا تھا.... اودہ.... کیپٹن اودہ.... کیپٹن نے کتنے خوش نصیب ہو!.... اس نے تمہیں اپنے قریب بلایا تھا اپنا ہاتھ پیش کیا تھا۔ بیٹھ جاؤ.... بیٹھ جاؤ.... تم واقعی بڑے ہمت والے ہو۔ اگر وہ مجھے اپنے قریب بلاتی تو.... میرا تو دم ہی نکل جاتا۔“

اس نے حمید کو قالین پر بٹھا دیا۔

دوسری صبح فریدی حمید کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ حفاظتی چوکی سے ٹرانس میٹر کے ذریعہ اس نے ہیڈ کوارٹر کو حالات سے آگاہ کیا تھا اور اسے ہیڈ کوارٹر سے اختیار ملا تھا کہ وہ سینڈ آفیسر کو کویتی طور پر انچارج بنا کر اپنا کام دیکھے۔ وادی کا جیک کا پُراسرار دھانی منارہ ہیڈ کوارٹر کے لئے بھی الجھن کا باعث بن گیا تھا۔ لہذا فریدی کو یہ بھی بتایا کہ ایک فوجی تحقیقاتی کمیشن وادی کا جیک کی طرف روانہ ہو چکا ہے۔ فریدی اس اطلاع پر کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔

پھر وہ حمید کی تلاش میں نکلا۔ پچھلی رات کے تجربات نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ حریف کی نظر اس پر ہر وقت رہتی ہے۔ لہذا میک اپ بھی فضول ہی ثابت ہوگا۔ اسی لئے اس نے حفاظتی چوکی کے کمانڈر کا میک اپ ختم کر دیا تھا۔

قاسم کا خیمہ تلاش کرنے میں اُسے کوئی دشواری نہیں پیش آئی۔ کیونکہ وہاں کسی دیو قامت آدمی کو تلاش کر لینا کچھ مشکل نہیں تھا۔ مشکل کیوں ہو تا جب کہ قاسم پہلے ہی سے اس پاس والوں کے لئے موضوع گفتگو بنا رہا تھا۔ لیکن اس وقت اس کا خیمہ خالی ملا۔ فریدی نے سوچا ممکن ہے وہ لوگ ”کیپٹن شبنہ“ میں ناشتہ کرنے گئے ہوں۔ اس لئے وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔

راہ میں کرل وارڈ کے خیمے کے قریب اُسے رک جانا پڑا۔ کیونکہ اندر سے حمید کے گانے کی آواز آرہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی تال اور سر میں لکڑی بجائی جا رہی تھی۔ پھر کوئی دوسرا بھی حمید کی آواز میں آواز ملانے لگا۔ حمید گارہا تھا۔

زہرہ ہفت افلاک کی نذر ہیں! عشرتیں راحتیں، زندگی اور دل دل جو معمور ہے زہرہ ہفت افلاک کے عشق سے زہرہ ہفت افلاک کا عشق ہے حاصل زندگی فریدی بغیر اجازت پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔ لیکن آج کل اُسے کس بات پر حیرت نہیں ہوتی تھی۔ پھر وہ حمید کو اس حال میں دیکھ کر حیرت کیوں ظاہر کرتا۔

حمید کا حلیہ عجیب تھا۔ اس کے سر پر بھی سمور کی ٹوپی تھی اور جسم پر لبادہ.... وہ قالین پر دو زانو بیٹھا ہوا گارہا تھا اور اس کے سامنے اسی پوزیشن میں کرل وارڈ بیٹھا گانے کی تال اور سر کے ساتھ دو بڑی بڑی ہڈیاں بجا رہا تھا۔ کبھی وہ بھی گانے لگتا۔ دونوں کی آنکھیں بند تھیں اور ان کے درمیان ایک انسانی کھوپڑی رکھی ہوئی تھی۔

”میزن کے شروع ہی میں میں نے یہ خیمہ اپنے لئے بک کر لیا تھا۔“
”مگر تم زیادہ تر دارالحکومت میں نظر آتے ہو۔“

”کیوں نہ آؤں! کیا میری نقل و حرکت پر کسی قسم کی پابندی لگادی گئی ہے۔“
”کیا تم آدمیوں کی طرح گفتگو کرنے پر مجبور نہیں کئے جاسکتے۔“ فریدی غرایا۔
”آپ کیوں ہمیں بور کر رہے ہیں۔“ حمید بول پڑا۔

”تم!...“ فریدی اسے گھورتا ہوا بولا۔ ”اٹھو اور چپ چاپ باہر نکل جاؤ۔“
”میں زہرہ ہفت افلاک کا دامن نہیں چھوڑ سکتا۔“

”کیا بک رہا ہے!...“

”آصف سے پوچھ لیجئے!...“ حمید نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ اس کی نگاہ وسط میں رکھی ہوئی کھوپڑی پر تھی۔

آصف نے فریدی کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔

اور وہ سب باہر نکل آئے۔... آصف نے فریدی سے پوچھا۔ ”تم کب آئے!...“
لیکن فریدی نے اس کے سوال کا جواب دیے بغیر خود اس سے پوچھا۔
”آپ لوگ یہاں کیا کر رہے تھے۔“

آصف نے فزا رو کے آسیب زدہ کمرے کی داستان چھیڑ دی۔... حمید اور کرنل وارڈ کی آوازیں اب بھی خیمے سے آرہی تھیں زہرہ ہفت افلاک کا بھیجن جاری تھا، فریدی حالانکہ اس آسیب کی کہانی حمید سے بھی سن چکا تھا۔ لیکن آصف کی زبان سے نہایت صبر و سکون کے ساتھ معلومات حاصل کرتا رہا جیسے یہ حیرت انگیز واقعات پہلی بار اس کے سامنے آئے ہوں۔

”حمید رات ہی سے عجیب و غریب حرکتیں کرتا رہا ہے۔“ آصف نے کہا اور ہیکے ہوئے سوٹ کی کہانی دہراتا ہوا بولا۔ ”اس کے بعد ہم جب صبح سو کر اٹھے تو وہ بستر سے غائب تھا۔ اچانک میں نے اسی آسیب کی آواز سنی جو ہمیں کرنل وارڈ کے خیمے میں جانے کی ہدایت کر رہی تھی۔ یہاں پہنچے تو حمید صاحب کو اس حال میں دیکھا۔ دیکھو میری سنو۔ کسی اچھے عامل سے رجوع کرو۔ حمید پر سایہ ہو گیا ہے۔“

یہ حیرت انگیز کہانی پہلی بار قاسم کی سمجھ میں آئی تھی اس لئے اس کا حلیہ دیکھنے سے متعلق

قریب ہی زیبا قاسم اور آصف کھڑے متحیرانہ انداز میں پلکیں جھپکا رہے تھے۔ آخر فریدی کو دیکھ کر چونک پڑا اور زیبا پر کچھ اس قسم کی نظر ڈالی جیسے وہاں اس وقت اس کی موجودگی اس کے لئے کوئی بڑی آفت لائے گی۔

”یہ دیکھئے اپنے شاگرد رشید کے کرتوت!...“ آصف نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
اس کی آواز پر ان دونوں نے اس طرح خاموش ہو کر آنکھیں کھول دیں جیسے ان کی موجودگی سے بے خبر رہے ہوں۔ دونوں ہی کی آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔

”جائیے!...“ حمید ہاتھ ہلا کر فریدی سے بولا۔ ”میں اب آپ کے کام کا نہیں رہا۔ جاؤ اپنی عقل کو چگاتے پھرئے۔ مجھے تو نیا گیان ہوا ہے۔ میں زہرہ کا پجاری ہوں۔... جائیے۔“
میری واپسی نہ ممکن ہے۔“

”سن لیا!...“ آصف بڑا سامنے بنا کر بولا۔ ”یہ تم سے بھی بڑھ جائے گا۔“

”یہ تم نے کیا کیا۔“ فریدی نے حمید کی طرف اشارہ کر کے کرنل وارڈ سے کہا۔

”آپ کون ہیں اور بغیر اجازت میرے خیمے میں کیوں گھس آئے۔“ کرنل وارڈ اٹھتا ہوا بولا۔
”تم کرنل وارڈ ہو۔“ فریدی نے پوچھا۔

”ہاں میرے نام کے سلسلے میں تم غلطی پر نہیں ہو۔“ کرنل وارڈ نے پرسکون لہجہ میں کہا۔
”اور اب براہ کرم باہر چلے جاؤ۔... ہماری عبادت میں خلل نہ ڈالو۔“

حمید نے پھر زہرہ ہفت افلاک کا بھیجن شروع کر دیا اور کرنل وارڈ پہلے ہی کی طرح ہڈیاں بجاتا رہا۔

”کرنل وارڈ!...“ دفعتاً فریدی گرجا۔ ”میں تم سے پوچھتا ہوں کہ یہ خیمہ کب سے تمہارا پاس ہے۔“

”میں کیوں بتاؤں! تم کون ہو۔“

فریدی نے جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کے آگے ڈالا۔

”اوہ!... تو!... مگر مجھے پولیس سے کیا سروکار۔“ کرنل وارڈ نے کارڈ دیکھ کر متحیرانہ

میں پوچھا۔

”میری بات کا جواب دو۔“

فریدی نے اس کھوپڑی پر ٹھوکر رسید کی.... وہ اچھل کر خیمے کی قنات سے جا نکلے اور پھر ایک زوردار دھماکہ ہوا.... اور خیمہ دھڑا دھڑھلنے لگا.... آصف چیختا اور زیبا کو کھینچتا ہوا باہر نکل گیا۔ پھر وہ ہلڑ ہوا کہ خدا کی پناہ.... دوسرے خیموں کی رسیاں کاٹ کاٹ کر انہیں گرایا جانے لگا کیونکہ آس پاس کے دو ایک خیمے اور بھی آگ کی لپیٹ میں آگئے تھے۔

”یہ کیا ہوا.... یہ آدمی کون تھا۔“ زیبا آصف سے پوچھ رہی تھی۔ آصف پر اب بھی لرزہ طاری تھا۔ وہ لوگوں کو خیمے گراتے اور آگ بجھاتے دیکھ رہا تھا۔

”وہ ایک ناعاقبت اندیش حیوان تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ خیمے ہی میں بھسم ہو گیا ہوگا۔“ آصف نے بدقت تمام کہا۔ اسے فریدی پر غصہ بھی آ رہا تھا۔

بمشکل تمام آگ پر قابو پایا جاسکا.... اس بھیڑ میں آصف کو قاسم بھی نظر آیا جو آگ بجھانے والوں کو مدد دے رہا تھا۔ جلتے ہوئے خیموں سے اس نے دو تین آدمیوں کو باہر نکالا تھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ وہ ان کی طرف آ رہا ہے۔

”حق.... کرئل صاحب کہاں ہیں۔“ اس نے قریب پہنچ کر آصف سے پوچھا۔

”پتہ نہیں....!“

”پتہ نہیں....!“ قاسم ہاتھ نچا کر جھلائے ہوئے لہجہ میں بولا۔ ”بس تم ان سے چپکے کھڑے رہو۔ شرم نہیں آتی۔“

”کیا بکواس ہے۔“ آصف آنکھیں نکال کر غرایا۔

”اے جاؤ.... بڑھے ہو گئے تمہارے برابر میرے لڑکے ہوں گے.... نن نہیں....“

میرے برابر تمہارے لڑکے ہوں گے۔“

”تم ہوش میں ہو یا نہیں....!“

”میرے پہلو میں بھی ہوتی تو میں ہوش میں نہ ہوتا۔“ قاسم نے کہا شاید اس کی ذہنی رو بہک گئی تھی۔ یا پھر وہ پچھلی رات ہی دل میں آصف پر تازہ کھانا رہا تھا کہ اس وقت اہل ہی پڑا....

اُسے یہ چیز پہلے گراں گزری تھی کہ اتنا بوڑھا آدمی کسی اتنی جوان لڑکی سے ”محبوبت“ کرے۔

”تم نے بھی آواز سنی تھی۔“ فریدی نے قاسم سے پوچھا۔

”نن.... نہیں.... میں نے تو نہیں سنی۔“ قاسم نے کہا۔ فریدی نے زیبا کی طرف دیکھا اس نے بھی سر ہلادیا ویسے وہ فریدی کو اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے وہ اسے خواب میں نظر آیا ہو شروع سے اب تک ایک پل کے لئے بھی اس کی نظریں فریدی سے نہیں ہٹی تھیں۔

”ہوں....!“ فریدی آصف کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اس کی نگاہ اس کے واسطے ہاتھ پر رک گئی۔

”دیکھو....!“ آصف نے بزرگانہ انداز میں کہا۔ ”تم روحانیت کے قائل نہیں ہو۔“

”یہ کس گدھے نے کہہ دیا آپ سے.... ہاں میں بھٹکنے والی روحوں کا قائل نہیں ہوں۔ سو فیصدی فراڈ ہوتا ہے یا کسی ذی روح کی شیطانی قوت ارادی کا کرشمہ....!“

”کچھ بھی سہی! یہ شیطانی قوت تمہیں نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔“

فریدی تحقیر آمیز انداز میں ہنسا اور بولا۔ ”میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔“

خیمے میں وہ دونوں اب بھی اسی سرگرمی کے ساتھ ہڈیوں کی تال پر بھین گارہے تھے۔

فریدی اندر جانے کے لئے مڑا.... وہ لوگ پھر اس کے پیچھے لگ گئے۔ قاسم سے شاید حرکت غیر ارادی ہی طور پر سرزد ہوئی تھی ورنہ وہ بیچارہ آسیب کا شدت سے قائل تھا اور انکا باتوں سے تو اس کا دم ٹکلتا تھا۔

لیکن خیمے میں داخل ہوتے ہی ایک بار تو فریدی بھی چکر اگیا۔ کیونکہ وہ دونوں غائب تھے۔

مگر آوازیں.... آوازیں تو قالین پر رکھی ہوئی کھوپڑی سے آرہی تھیں۔

”ارے.... بب.... بب.... بب.... ہاں....!“ قاسم بھیسنوں کی طرح ڈکراتا ہوا باہر

بھاگا اور زیبا آصف سے چٹ گئی۔ آصف کو اتنا ہوش کہاں تھا کہ وہ اپنی جگہ سے بھی ہل سکا۔

فریدی کھوپڑی کی طرف بڑھا اور یک بیک کھوپڑی سے آواز آئی۔ ”خبردار کرئل آگے۔“

بڑھنا.... پچھتاؤ گے....!“ یہ اسی پراسرار عورت کی آواز تھی.... جس وقت وہ بولی تھی بھین

کی آواز ہلکی ہو کر بیک گراؤنڈ میں چلی گئی تھی۔ آصف اور زیبا ایک دوسرے سے چپے ہوئے بڑے

طرح کانپ رہے تھے۔

”چلو.....!“ فریدی ہاتھ سے اشارہ کرتا ہوا خیمے کی طرف بڑھ گیا۔ زیبا متحیرانہ انداز میں فریدی کو دیکھ رہی تھی اور شاید یہ چیز آصف کو گراں گزری تھی۔

وہ طوعاً کرہاً فریدی کے پیچھے چل پڑا۔ قاسم اور زیبا بھی چل رہے تھے۔

خیمے میں پہنچ کر فریدی قالین پر بیٹھ گیا اور آصف سے بولا۔ ”اب بتائیے کیا قصہ ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اس قصے سے پہلے حمید کو تلاش کرنا چاہئے۔“

”اے تو آسیب ہضم کر گیا۔“ فریدی مسکرایا۔ ”اس کی واپسی اب ناممکن ہے۔ ہاں خیر.....“

اب بھی آپ لوگوں کے ساتھ اس لڑکی کی موجودگی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔“

”آپ ہوتے کون ہیں پوچھنے والے۔“ آصف نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”آپ کو شاید میرے اختیارات کا علم نہیں ہے۔ میں انپکٹر جنرل کے کاموں میں بھی مداخلت کر سکتا ہوں۔ اگر ضرورت پڑے..... ویسے یہ اور بات ہے کہ میں اس مداخلت کو مشورے کا رنگ دے دوں۔“

”آپ خواہ مخواہ..... مجھ پر دھونس بجانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہاں نہیں چلے گی۔“

دفعۃً فریدی لڑکی کی طرف مڑا۔

”لڑکی تم کون ہو۔“

”ان لوگوں نے مجھے پاگل بنا کر رکھ دیا ہے جناب! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔“

”تم کوئی غیر ذمہ دار نہ گفتگو نہیں کرو گی۔“ آصف نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”لڑکی تمہیں جو کچھ بھی کہنا ہے نذر ہو کر کہو۔ آصف صاحب باہر جاسکتے ہیں۔ ورنہ مجھے مجبوراً کوئی غیر سرکاری قدم اٹھانا پڑے گا۔“

آصف نے فریدی کے چہرے کی طرف دیکھا اور دم بخود رہ گیا۔

”ان کے سیکریٹری نے مجھ سے کہا تھا کہ میں انہیں بیوقوف بنا کر ان سے رقومات وصول کروں۔ یہ ایک بہت بڑے سیٹھ ہیں۔ میں فزارد میں ویٹریس ہوں جناب۔“

”دیکھا..... دیکھ لیا۔“ آصف آنکھیں نکال کر بولا۔ ”سیکریٹری سے مراد حمید ہے۔“

”دیکھ لیا، مگر آپ اس کے آفیسر تھے..... آپ نے اس لڑکی کو اپنے اوپر مسلط ہی کیوں ہونے دیا تھا۔“

”میں تمہارے ہتھکڑیاں لگوا دوں گا۔“ آصف غصے سے کانپتا ہوا بولا۔

”اے جاؤ مر گئے..... ہتھکڑیاں لگوانے والے..... چلو..... تم ادھر آؤ۔“

قاسم نے زیبا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ پتہ نہیں قاسم کو کیا ہو گیا تھا۔ اس سے ان کی جرات کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ ارے یہ وہی قاسم تو تھا جو عورتوں کی موجودگی میں ہکلا کر لگتا تھا۔ وہ لوگ جن سے بے تکلفی نہ ہوا ان کے سامنے عورت کے مسئلے پر گفتگو کرنے کے لئے زبان نہیں کھلتی تھی۔

”میں تمہیں گولی مار دوں گا۔“ آصف نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ اتنے میں فریدی نہ جانے کدھر سے آنکلا اس کے ساتھ دو فوجی بھی تھے۔

”ٹھہرو.....!“ آصف نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”اسے سمجھاؤ..... ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“

فریدی نے قاسم کو گھور کر دیکھا..... اور قاسم جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں بھی کیا کہوں گا۔ میری بھی سنئے۔“ وہ ابھی تک زیبا کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا اور زیادہ دم بخود تھی۔

معلوم ہوتا تھا جیسے کہانیوں والے کسی آدم خور دیو سے سابقہ پڑ گیا ہو۔

فریدی نے فوجیوں سے کہا۔ میں نے اس خیمے کی جگہ چاک سے نشان لگا دیا ہے وہاں پونٹ لگھنے دو آدمیوں کی ڈیوٹی رہے گی۔

فوجی اسے سلیوٹ کر کے خیموں کی طرف چلے گئے۔

”ہاں..... کیا بات ہے۔“ فریدی نے انہیں باری باری سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اسی سے پوچھو.....!“ آصف نے قاسم کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”جہاں سنبھال کر تم خود اسی..... اسی.....!“ قاسم دھاڑا۔

”خاموش رہو۔“ فریدی نے ڈانٹا اور قاسم ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑاتا ہوا خاموش ہو گیا۔ پھر فریدی نے اس سے کہا۔ ”اس کا ہاتھ کیوں پکڑ رکھا ہے۔“

قاسم بُری طرح چونکا اور اس کا ہاتھ چھوڑ کر لڑکھڑاتا ہوا دو چار قدم پیچھے ہٹ گیا۔

بوکھلا کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔

”کیا تمہارا خیمہ جل گیا۔“ فریدی نے قاسم سے پوچھا۔

”نہیں..... جی نہیں..... وہ رہا!“ قاسم نے خیمے کی طرف اشارہ کیا۔

”ہائیں.....!“ اس نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ”کل رات کوئی عورت میرے کان میں بھی چلیں چلیں کر رہی تھی شاید۔“

”یعنی.....!“ فریدی کی نظریں اس کے چہرے پر گز گئیں۔

میں یہاں لیٹا ہوا سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ بس چلیں چلیں کی آواز آئی پھر غور کیا تو معلوم ہوا کہ کوئی عورت گارہی تھی۔ ”نل کے پچھر گئیں انکھیاں..... میں نے کہا ٹھیک سے اور سو گیا۔!“

”تم کہاں لیٹے تھے.....!“

”ادھر.....!“

”آصف صاحب کہاں تھے۔“ فریدی نے پوچھا اس کی نظر آصف کے داہنے ہاتھ پر جمی ہوئی تھی۔



”بس ہم دونوں ایک ہی جگہ پر سر رکھے ہوئے تھے۔ مگر ان کی ٹانگیں اتر کی طرف اور میری ٹانگیں دھن کی طرف۔ یعنی کہ یوں“ قاسم بتاتے بتاتے لیٹ گیا اور پھر بولا۔ ”بس یہ اوھر لیٹے تھے اور ہم دونوں کی کھوپڑیاں ملی ہوئی تھیں..... اے آؤ تم بھی لیٹ کے دکھا دو۔“

آصف نے کچھ اور زیادہ برامہ بنالیا۔

”اٹھ بیٹھو..... میری سمجھ میں آگیا۔“ فریدی نے کہا اور آصف کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ ان دونوں کو باہر جاتے دیکھ کر قاسم خوش ہو گیا۔ مگر زیادہ کچھ بدحواسی نظر آرہی تھی۔

”کیا میں بھی چلوں.....!“ اس نے پوچھا۔

فریدی نے اس کی طرف مزے بغیر کہا ”نہیں“ اور باہر نکل گیا۔

زیبا چپ چاپ بیٹھی رہی۔ قاسم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس قسم کی گفتگو چھیڑے۔ پہلے تو اسے خوشی ہوئی تھی کہ یہ لوگ جارہے ہیں اب وہ جی بھر کے اس سے باتیں کرے گا..... مگر اب عقل ہی خط ہو کر رہ گئی تھی۔ بدقت تمام اس نے کہا۔ ”آپ کا نام زیبا ہی ہے۔“

یہ بھی اس نے کچھ ایسے ہچکچائے ہوئے اور شر میلے انداز میں پوچھا جیسے کہا ہو۔ ”جی..... کیا آپ مجھے پانچ روپے ادھار دے سکیں گی۔“

”م..... مگر..... میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کو رس بھری بیگم کہوں..... قاسم نے

”تم بے تکلف الزامات لگا رہے ہو۔ اس بیچاری نے ہمارے لئے ایک پناہ گاہ تلاش کی تھی اس لئے جب ہم یہاں آنے لگے تو اسے بھی ساتھ لیتے آئے۔“

”نہیں جناب..... یہ غلط ہے۔“ زیبا بولی۔ ”میں کوئی رئیس زادی نہیں ہوں کہ اس طرح سیر و تفریح کرتی پھروں.....!“

”مجھے دو ماہ کے لئے ملازم رکھا گیا تھا۔ واہ یہ اچھی رہی۔“

”کس نے ملازم رکھا تھا۔“ آصف آنکھیں نکال کر بولا۔

”آپ کے سیکریٹری نے.....!“

”تو..... وہی تنخواہ بھی ادا کرے گا.....!“

”میں اواروں گا۔“ قاسم چھاتی ٹھونک کر بولا۔ ”اب ایسے حمید بھائی پر ہزاروں نثار کر رہے ہوں تم کیا سمجھتے ہو..... ہاں جی بتاؤ کتنی تنخواہ ملے ہوئی تھی۔“

”ڈھائی سو۔“ زیبا نے جواب دیا۔

”بس..... پچیس.....!“ قاسم نے آصف کی طرف دیکھ کر دانت نکالے اور پھر لڑکی بولا۔ ”میں پانچ سو دو گامیرا پیارا حمید بھائی.....!“

یک بیک قاسم کی آواز گلوگیر ہو گئی..... ذہنی رو بہک گئی تھی۔ آنکھیں ڈبڈبا آتی تھیں باقاعدہ طور پر آنسو بہنے لگے..... ”اب وہ کبھی واپس نہ آئے گا۔ کھوپڑی میں گھس گیا.....“ کرنا تھا..... دینو حمید بھائی لونڈیوں کا چکر براہوتا ہے اب وہ کبھی نہیں آئے گا..... ہائے میں کروں کر نل صاحب! اس سالی زہرہ سخت اخلاقی قاپٹے لگائے۔“

”اس کا پتہ کہاں لگاؤں..... ہوا سے کون لڑے گا۔ صبر کرو.....!“

”ہائے کیسے صبر کروں۔“ قاسم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ”کلیجے کو منہ آ رہا ہے۔ اب! پیارا بھائی کہاں سے ملے گا۔ ہائے سب کچھ یاد آ رہا ہے..... کہتا تھا..... دیکھو پیارے..... وگیاں..... فل فلوٹیاں..... یلا یلیاں..... مجھے جینے نہیں دیں گی..... ہائے وہی ہوا..... آبیہ لونڈیا سمجھ کر کھوپڑی میں سما گیا..... ارے باپ رہے۔“

قاسم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ گریہ زاری میں اچانک بریک لگ گیا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا اُسے کوئی بات یاد آگئی ہو۔



سر جھکا کر داہنے ہاتھ سے بالیاں ہاتھ مڑوتے ہوئے کہا۔ ”زیبا تو ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے کسی کو چھت سے الٹا لٹکا دیا ہو۔“

”جودل چاہے کہئے“ زیبا مسکرائی۔ ”اب تو میں آپ کی ملازم ہوں۔ آپ پانچ سو دیں گے نا۔“
 ”پانچ سو کیا میں پانچ ہزار بھی دے سکتا ہوں۔“
 ”خالی خولی باتیں!۔۔۔!“

”نہیں۔۔۔ میں اُلا قسم۔۔۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔۔۔ یقین نہ آئے تو کرل صاحب سے پوچھ لو۔“ قاسم نے کہا وہ ابھی تک داہنے ہاتھ سے بالیاں ہاتھ مڑے جا رہا تھا۔
 ”یہ کرل صاحب کون ہیں۔“

”ارے۔۔۔ آپ کرل صاحب کو نہیں جانتیں۔۔۔ کرل فریدی صاحب سی آئی ڈی والے۔“
 ”اوہ۔۔۔ تو یہ کرل فریدی تھے۔“ زیبا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
 ”اور وہ حمید بھائی تھے جنہیں وہ کھوپڑی چٹ کر گئی۔“

”میرے خدا تو آپ وہی ہیں جس کا تذکرہ میں فزار و میں پہلے بھی سن چکی ہوں۔ بہت دنوں کی بات ہے جب ٹیکم گڈھ میں برف کے جھوتوں والا قصہ ہوا تھا۔“

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ اور کیا۔“ قاسم خوش ہو کر بولا۔ ”ہاں میں وہی ہوں۔۔۔ ارے باپ رے۔“ وہ بڑی تیزی سے چیخ کر بے تحاشہ جھک پڑا اور اس کا سر زمین سے جا ٹکرایا۔

اس بار بے خیالی میں اس نے اپنا بالیاں ہاتھ ذرا زیادہ زور سے مروڑ لیا تھا۔
 ”ارے کیا ہوا۔۔۔!“ زیبا اس کی طرف جھٹی۔

”حق۔۔۔ تجھ۔۔۔ نہیں۔۔۔!“ قاسم سیدھا ہو کر جھینپی ہوئی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ”اکثر ہو جاتا ہے۔“

”کیا ہو جاتا ہے۔“ زیبا نے جلدی سے پلکیں جھپکائیں۔
 ”ارے۔۔۔ بس وہ یونہی۔۔۔ ذرا زیادہ زور لگ جاتا ہے۔۔۔!“

”آپ کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔“ زیبا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”جب آپ سے محبت۔۔۔!“
 ”ہائیں۔۔۔!“ قاسم یک یک اچھل پڑا اور زیبا نے شرما کر سر جھکا لیا۔ پہلے تو قاسم کی شکل بارہ بجتے رہے پھر یک یک اس کی ”ہی ہی“ اشارت ہو گئی۔

فریدی آصف کو ساتھ لئے نشیب میں اترتا چلا گیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد بائیں جانب مڑا۔ وہ دراصل حفاظتی چوکی کی طرف جا رہا تھا کیونکہ کچھ دیر پہلے اس نے یہی کوپڑوں کی آواز سنی تھی۔ اسے یقین تھا کہ آنے والے فوجی تحقیقاتی کمیشن ہی کے ممبر ہوں گے جن کی روانگی کی اطلاع اُسے پہلے ہی مل چکی تھی۔

”بھئی کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم حمید کے معاملے میں اتنے مطمئن کیوں ہو۔“ آصف نے کہا۔
 ”پھر کیا ہو سکتا ہے۔۔۔ اگر آپ کی دانست میں وہ کوئی آسیبی ہی معاملہ ہے تو میرے فرشتے بھی بے بس ہو جائیں گے!“

”مگر تم اُسے آسیبی معاملہ سمجھتے کب ہو۔“
 فریدی کچھ نہ بولا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔ دونوں خاموشی سے راستہ طے کر رہے تھے۔
 پھر فریدی نے کہا۔ ”کیا میں وہ انگوٹھی دیکھ سکتا ہوں جو آپ کے داہنے ہاتھ میں ہے۔“

”اوہ۔۔۔ یقیناً۔۔۔ اس کا نگینہ عجیب ہے۔“
 ”ہاں نگینے ہی پر میں بھی غور کر رہا تھا۔۔۔ واقعی عجیب ہے۔ جیسے چاندی اور لوہا ملا کر بنایا گیا ہو۔ اس کی سطح کتنی چمکدار ہے۔۔۔!“

آصف نے انگوٹھی انگلی سے اتار کر اسکی طرف بڑھادی۔ فریدی اُسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔
 ”پوری ہی حیرت انگیز ہے۔“ اس نے کہا۔ ”نہ تو نگینہ ہی پتھر کا معلوم ہوتا ہے اور نہ یہ دھات۔۔۔ نہیں یہ دھات نہیں یہ تو پلاسٹک یا سخت قسم کا بڑا معلوم ہوتا ہے جس پر سنہرا پالش چڑھایا گیا ہے۔۔۔ یہ انگوٹھی کتنے میں خریدی تھی آصف صاحب۔“

”بھئی۔۔۔ یہ تو بڑی پائی تھی۔۔۔“ آصف کھسیانی ہنسی کے ساتھ بولا۔
 ”کہاں۔۔۔؟“ فریدی چلتے چلتے رک گیا۔

”فزارو کے اسی کمرے میں جہاں ہم پہلے ٹھہرے تھے۔۔۔ ہاں۔۔۔ یار دیکھو یہ حمید نے خواہ خواہ۔۔۔ بڑھاپے میں میری مٹی پلید کی ہے۔ اس لڑکی کو خواہ خواہ میرے پیچھے لگا دیا۔“

”آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ اگر وہ مل گیا تو میں اس سے سمجھوں گا۔ ہاں کیا ایسی کوئی انگوٹھی حمید کے ہاتھ میں بھی تھی۔“

”میں نے دھیان نہیں دیا.... کیوں....؟“

”بس یونہی.... شاید آپ تھک گئے ہیں۔ آئیے کچھ دیر کہیں بیٹھ لیں۔“ وہ ایک چٹائی بیٹھ گئے.... آج صبح ہی سے مطلع ابر آلود تھا۔ اس لئے خنکی کچھ بڑھی ہوئی سی معلوم ہو رہی تھی۔ مگر اتنی بھی نہیں کہ ناخوشگوار ہو جاتی۔ اس وقت تو پورا آسمان بھورے رنگ کے بارش سے ڈھک گیا تھا.... یہاں اس قسم کے بادل صرف ہلکی قسم کی پھواروں کا پیش خیمہ سمجھے جاتے تھے فریدی اس انگوٹھی کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔

”کیوں! کیا اس میں کوئی خاص بات ہے۔“

”وہ خاص باتیں ہوتا چکا ہوں۔ جو عام انگشتریوں میں نہیں پائی جاتیں! دیسے پلاسٹک انگشتریاں ہوتی تو ہیں مگر یہ گینہ.... کتنا ذہنی ہے۔“ فریدی نے اسے اپنی چھنگلیاں میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”کیا میں کچھ دیر اسے پہن سکتا ہوں۔“

”ضرور.... ضرور....!“ آصف نے سر ہلا کر کہا اور کچھ سوچنے لگا۔

”فزا دو الے کمرے میں کتنی آرام کرسیاں تھیں....!“ فریدی نے پوچھا۔

”کیا مطلب....!“ آصف چونک پڑا.... پھر بولا۔ ”پتہ نہیں.... آہاں.... ایک“

شاید۔ ہاں ایک ہی تھی۔“

”اور اس کی پشت گاہ کے اوپری حصے میں باریک باریک سوراخوں سے ایک پیٹرن بنا“

تھا۔“ فریدی نے کہا۔

”اتنا تو مجھے یاد نہیں مگر تم یہ بات کیوں نکال بیٹھے ہو۔“

”کچھ نہیں۔“ فریدی مسکرایا۔ ”میرے آدمیوں نے وہ کرسی توڑ ڈالی ہے اور اس حصے“

ایک چھوٹا سا خود کار ٹرانسمیٹر برآمد کیا ہے جس میں سوراخوں والا پیٹرن تھا۔“

”نہیں....!“ آصف نے حیرت سے کہا۔ ”مگر میں نے تو چلتے پھرتے ہوئے اس کی آواز“

سنی ہے۔“

”آپ اپنی انگلی میں ایک ننھا سا ٹرانسمیٹر ڈالے پھرتے رہے ہیں۔“ فریدی مسکرایا۔

”یہ انگوٹھی۔“ آصف اچھل پڑا.... ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس پر بم گرا ہو۔ وہ چند لمحوں

ایسی حالت میں رہا جیسے سکتے ہو گیا ہو۔ پھر چونک کر بولا۔ ”یار تم پتہ نہیں کہاں کی اڑا رہے ہو۔“

یہ اتنا ڈرا سا ٹرانسمیٹر.... کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہے۔“

”جس دور میں انفراریڈ کمرے بنائے جا رہے ہیں اس دور میں سب کچھ ممکن ہے آصف صاحب۔“

”یہ کیا ہوتا ہے....!“

”ماضی کی تصویریں لیتا ہے۔“

آصف بے اعتباری سے ہنسا۔

”ابھی حال ہی میں ایک بڑے ملک نے اس کا تجربہ کیا ہے۔ ٹیکسیوں کے ایک اڈے کی

تصویر اس وقت لی گئی جب وہ پانچ منٹ پہلے بالکل خالی ہو چکا تھا۔ لیکن فلم پر ان تمام گاڑیوں کی

تصاویر آگئیں جو پانچ یا دس منٹ پہلے اُس اڈے پر موجود تھیں۔“

”اچھا.... ہاں! میں نے بھی سنا تھا۔ نام ذہن سے اُتر گیا تھا۔ مگر یہ انگوٹھی.... یہ اتنا ننھا

ٹرانسمیٹر میری سمجھ میں نہیں آتا....!“

فریدی کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ ساتھ ہی وہ اپنے سر پر ہاتھ بھی پھیرتا جا رہا تھا کہ اچانک چونک

پڑا۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے آصف سے پوچھا۔ ”کچھ سنا۔“

”کیا سنا....!“ آصف نے حیرت سے پلکیں چپکائیں۔ ”میں تو کچھ نہیں سن رہا۔“

”اب سنئے....!“ فریدی نے اپنا دہانہ ہاتھ آصف کے چہرے کے قریب کر دیا اور آصف

کے کانوں میں یہ قلمی گیت کسی منڈے کی طرح بھدکنے لگا۔

”مار کٹاری مر جانا پہ اکھیاں نہ لڑانا.... جی“

”میرے خدا.... مم.... مگر.... یہ اب بھی نہیں معلوم ہوتا کہ یہ آواز اسی انگوٹھی سے

آ رہی ہے۔“ آصف نے کہا۔

”یہی تو کمال ہے.... اگر انہیں معلوم ہو جائے کا خدشہ ہو تا تو یہ اس طرح استعمال نہ کی

جاتیں۔ اب یہی دیکھ لیجئے کہ آپ اسے اتنے دنوں تک انگلی میں ڈالے رہے مجھے اس انگوٹھی کا

خیال کبھی نہ آتا اگر قاسم نے یہ نہ بتایا ہوتا کہ کوئی عورت اس کے کانوں میں گارہی تھی تو شاید

میں اس انگوٹھی کو دیکھ کر نہ چونکتا۔ قاسم آپ کے قریب ہی لیٹا تھا ہو سکتا ہے آپ کا ہاتھ اس

کے کان کے قریب رہا ہو۔“

آصف کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں اور وہ فریدی کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ

جنت و جہنم

حمید جھوم جھوم کر بھیجن گارہا تھا کہ اچانک کر تل وارڈ نے ایک ہی ہاتھ سے اس کی سوزی ٹوپی گرائی اور پھر دونوں ہڈیاں اس کے سر پر بجا کر رکھ دیں۔ چوٹ اتنی شدید تھی کہ حمید کو کی وجہ پوچھنے کی بھی مہلت نہ مل سکی۔ اور وہ بصد خلوص نیت انشا غفیل ہو گیا۔ انشا غفیل ہی چاہئے کیونکہ اس لفظ کی سوتی کیفیت ہی اس پجوشن کا نقشہ کھینچ سکتی تھی۔

بہر حال انشا غفیل ہونے کے بعد پھر اس کا ہوش کب رہتا ہے کہ مردہ جنت کی طرف جا ہے یا جہنم کی طرف۔ پھر جب اسے ہوش آیا تو کافی دیر تک آنکھوں کے سامنے سے دھندلا چھٹ سکی۔ آہستہ آہستہ ذہن بھی صاف ہوا اور نظر بھی ٹھیک ہوئی مگر سر بڑی شدت سے دکھ رہا تھا۔ ”ہائیں.....!“ اور پھر وہ اچھل کر بیٹھ گیا۔ اس کے چاروں طرف موسمی شمعیں روشن تھیں اور وہ خود کفن میں لپٹا ہوا تھا۔ بوکھلاہٹ میں وہ آیت الکرسی پڑھنے لگا۔ اس کی آواز بلند ہوتی گئی جب آیت الکرسی ختم کر چکا تو کلمہ پڑھنے لگا۔ پھر چیخا۔ ”ارے بھائی میں مسلمان ہوں..... زہر ہفت افلاک پر ہزار بار لعنت..... میں تو مذاق کر رہا تھا..... گھس رہا تھا سارے کر تل وارڈ کو۔ ارے کوئی ہے.....!“

پھر اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں اپنے جسم پر درجنوں چمکیاں لے ڈالیں۔ جب اے یقین ہوا کہ وہ عالم ارواح میں نہیں ہے بلکہ باقاعدہ طور پر چوٹ کھا کر بلبلانے والا جسم بھی ہے۔ مگر یہ کفن..... اہ..... کر تل وارڈ نے فریدی وغیرہ کے باہر چلے جانے کے بعد اس کے پر ہڈیاں ماری تھیں اور وہ چکر اکر گر پڑا تھا..... مگر وہ اس مقبرے میں کیسے پہنچا۔ وہ مقبرہ ہی تھا جس کی دیواروں پر قدیم اصنام کے نمونے موجود تھے۔

لیکن یہاں نہ تو گھٹن تھی اور نہ کسی قسم کی ناخوشگوار بو..... دفعتاً اس نے کسی کو حلق پھانے سنا جس کے گانے کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔

زاہد نہ کہہ بُری کہ یہ مستانے آدمی ہیں

تجھ سے لپٹ پڑیں گے دیوانے آدمی ہیں

آواز بھی ایسی ہی تھی جیسے اس نے بہت زیادہ چڑھا رکھی ہو۔ اچانک گانے والا ایک تاریک درپچے سے اندر داخل ہوا..... اس کے دونوں ہاتھوں میں بوتلیں تھیں..... اچھا خاصا تندرست اور وجہہ نوجوان تھا جسم پر سیاہ پتلون اور سفید قمیض تھی بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔

حمید اسے دیکھ کر کفن سمیت کھڑا ہو گیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اب اس کفن کو تہہ کی طرح باندھ لے ورنہ زندوں کا کفن برہنگی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

”ہائیں..... تم اٹے ہو یا سیدھے۔“ شرابی نے جھک کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم آدمی ہو یا گدھے.....!“ حمید نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

”اے..... یو شٹ اپ.....!“ وہ سیدھا ہو کر تن گیا۔ ”میں جیلانی ہوں..... جیلانی..... دنیا کا سب سے بڑا آرٹسٹ..... مجھ سے بڑا آرٹسٹ آج تک نہیں پیدا ہوا۔“

”تم پر لے سرے کے گدھے ہو۔ کیونکہ تمہیں بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں ہے۔“

”آرٹسٹ کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ بات کرنے کا بھی سلیقہ رکھتا پھرے۔ ہم اپنے فن ہی سے پہچانے جاتے ہیں۔ پوچھے جاتے ہیں۔“

”کچھ بھی ہو میں تمہیں گدھا کہہ چکا ہوں..... اور تم گدھے ہو چکے ہو۔ تمہاری شکل اس وقت گدھوں کی سی ہے۔ یقیناً نہ ہو تو جا کر آئینہ دیکھ لو۔“

شرابی نے بوکھلاہٹ میں دونوں بوتلیں فرش پر رکھ دیں اور اپنا چہرہ مٹولنے لگا۔

”جھوٹے کہیں کے۔“ بلا آخر اس نے روہانسی شکل بنا کر کہا۔

”مٹولنے سے پتہ نہیں چلے گا.....“ حمید نے کہا۔

”دیکھو.....!“ شرابی انگلی اٹھا کر جھومتا ہوا بولا۔ ”دیکھو..... مجھ سے دشمنی نہ مول لو۔ زہر ہفت افلاک میری محبوبہ ہے۔ میں نے اُسے دیکھے بغیر اس کی تصویر بنائی تھی۔ جب سے مجھ پر عاشق ہو گئی ہے۔ مجھ پر مرتی ہے..... جان دیتی ہے..... ہائے وہ چاند کا ٹکڑا ہے..... زہر ہفت افلاک۔“

اس نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا۔

”وہ تمہاری محبوبہ ہے تو تم نے اُسے قریب سے دیکھا ہو گا۔“

”قریب سے۔“ اس نے جھومتے ہوئے تہقہہ لگایا۔ ”ارے تم قریب سے کہتے ہو ہا۔“

ہا۔۔۔۔۔ یہ فخر میرے علاوہ آج تک کسی کو نہیں حاصل ہو سکا۔۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔۔! گاتا ہے۔

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
جس کے شانوں پر تیری زلفیں پریشان ہو گئیں

”اچھا۔۔۔۔۔ حمید نے پلکیں جھپکائیں پھر آہستہ سے پوچھا۔ ”وہ گوشت کا جسم رکھتی ہے۔۔۔۔۔
یاد خواں کی طرح صرف دھوئیں کے مجسمے کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔“

”میرے لئے تو وہ گوشت ہی گوشت ہے۔۔۔۔۔ دکھتا ہوا گوشت۔۔۔۔۔ ہڈیوں کو پگھلا دینے
والا۔۔۔۔۔ مگر مندر میں وہ دھوئیں کے مجسمے کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ ارے مجھے تو وہ بے تحاشہ
پلاتی ہے۔ خود بھی جیتی ہے۔ اس سے پہلے خدا کی قسم کبھی چکھی بھی نہیں تھی مگر اب۔۔۔۔۔ تم ہی
بتاؤ پیارے جب زہرہ ہفت افلاک اپنے ہاتھوں سے پلائے۔۔۔۔۔ کون کا فرانکار کر سکتا ہے۔“

دفعۃً حمید نے ”یا شہنشاہِ مریخ“ کا نعرہ لگایا۔۔۔۔۔ چند لمبے ساکت کھڑا رہا پھر آنکھیں کھول کر
جیلانی سے بولا۔ ”جاؤ۔۔۔۔۔ یہاں سے جاؤ۔۔۔۔۔ ورنہ تمہیں یہیں بھسم کر دوں گا۔۔۔۔۔ تم مریخ کے
بھتیجے کے سامنے زہرہ ہفت افلاک کا نام لیتے ہو۔۔۔۔۔ جاؤ آرٹسٹ سمجھ کر چھوڑ دیا۔“
”تم۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔! جیلانی انگلی اٹھا کر بولا۔ ”مریخ کے بھتیجے ہو۔۔۔۔۔!“

”میرا درجہ بہت بلند ہے۔ میں مریخ کا بھتیجہ ہوں۔ عطارد کا بہنوئی اور مشتری کا خالو ہوں۔
کیا سمجھے۔ زہرہ ہفت افلاک۔۔۔۔۔ شو۔۔۔۔۔ ہینے۔۔۔۔۔ اب یہ نام میرے سامنے زبان پر نہ لانا۔“

دفعۃً اس مقبرہ نما عمارت میں ایک نسوانی قہقہہ گونجا۔ آواز اُسی پر اسرار عورت کی تھی۔
”کیپٹن حمید یہ نہ سمجھو کہ تم مجھے یو قوف بنانے میں کامیاب ہو گئے ہو۔ مجھے تمہاری فزارد
والی بیہوشی بھی یاد ہے۔ کیا اس میں صداقت تھی اور آج جو تم نے سوانگ رچایا تھا اس میں کتنی
سچائی تھی۔“

”ہائیں“ شرابی آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ ”تم زہرہ ہفت افلاک سے فراڈ کرتے ہو۔ اے ملکہ
افلاک۔۔۔۔۔ یہ کہتا ہے کہ میں۔۔۔۔۔ مشتری کا سالار ہوں۔“

”جیلانی۔۔۔۔۔ تم اپنی خواب گاہ میں آؤ۔۔۔۔۔ میں یہاں تمہاری منتظر ہوں۔“

”نہیں۔۔۔۔۔!“ حمید جیلانی کا ہاتھ پکڑتا ہوا بولا۔ ”میں اسے نہیں جانے دوں گا کیونکہ قید
تمہائی مجھے پسند نہیں ہے۔“

”قید۔۔۔۔۔!“ آواز میں تحیر تھا۔ ”تم یہ کیا کہہ رہے ہو کیپٹن! تم قیدی نہیں ہو۔ ارے میں
تو تمہیں اپنی جنت کی سیر کرانا چاہتی تھی۔ کچھ دن عیش کرو۔۔۔۔۔ چلے جانا جیلانی۔۔۔۔۔ تم انہیں
جوانوں کی جنت میں چھوڑ کر اپنی خواب گاہ میں چلے آؤ۔“
”مگر مجھے کفن کیوں پہنایا گیا ہے۔“

”کفن سے گزرے بغیر جنت کا دیدار کیسے کرو گے۔ کیپٹن! بس جاؤ۔۔۔۔۔ تمہیں مایوسی نہیں ہوگی۔“
”چلو۔۔۔۔۔!“ جیلانی جھومتا ہوا بولا۔

”ٹھہرو۔۔۔۔۔!“ اس نے کفن کو تہہ کی طرح باندھتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ اور پھر اس کے ساتھ
چل پڑا۔۔۔۔۔ ایک لمبی راہداری سے گزر کر جیلانی ایک بڑے درہیچے کے سامنے رک گیا۔ جس سے
ایک دبیز پردہ لٹک رہا تھا۔

”جاؤ۔۔۔۔۔ پیارے خدا حافظ۔۔۔۔۔ مگر یہ ضرور لیتے جاؤ۔“ اس نے ایک بوتل حمید کی طرف
بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”جاؤ راوی عیش لکھتا ہے جاؤ۔۔۔۔۔ تم پر ملکہ افلاک کا سایہ رہے۔“
حمید نے غیر ارادی طور پر بوتل اس سے لے لی اور جیلانی نے اُسے دھکا دیا اگر وہ سنسپل نہ
گیا ہوتا تو پردے سے لچھ کر گر جانا یقینی تھا۔ لیکن سنسپلنے کے باوجود بھی جب گر ہی جانے کو دل
چاہے تو۔۔۔۔۔؟

اندر پہنچ کر اس کی یہی کیفیت ہوئی یہاں تو۔۔۔۔۔ راوی عیش ہی نہیں بلکہ ”عیش کا چچا“ لکھتا تھا۔
درجنوں لڑکیاں۔۔۔۔۔ پن آپ گر لڑ۔۔۔۔۔ ایک خوارے کے گرد پڑی ہوئی تھیں۔۔۔۔۔ بالکل ہالی
وڈ کے کسی رنگین فلم کی حرم سرا کا منظر تھا۔

حمید کو دیکھتے ہی وہ کھڑی ہو گئیں؟ پھر جھک کر کورنش بجالائیں۔ ان میں سے ایک بے حد
خوبصورت لڑکی آگے بڑھی اور بلند آواز میں بولی۔ ”جہاں پناہ کا ملبوس مبارک لایا جائے۔۔۔۔۔
جہاں پناہ حمام سے برآمد ہوئے ہیں۔“

فوراً ہی ایک خوان لایا گیا جس میں کپڑے تھے اور ان پر نیام میں کی ہوئی ایک جڑاؤ تلوار رکھی تھی۔
خوان حمید کے سامنے رکھ دیا گیا اور دو لڑکیاں اُسے کپڑے پہننے میں مدد دینے لگیں۔ پھر
جب وہ سب کچھ پہن لینے کے بعد کمر سے پٹکا باندھ کر اس میں تلوار ٹھونس رہا تھا اسے بیساختہ
ہنسی آگئی۔۔۔۔۔ پھر جب سر پر تاج رکھا جانے لگا تو اس نے تلوار کھینچ لی اور لال پیلی آنکھیں نکال کر

اس کی جگہ لینے کا مقصد یہی تھا کہ کسی کو وادی میں نہ اترنے دیا جائے.... نقلی کمانڈر ادھر بھی دوچار آدمی ہر وقت لگائے رہتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اسی کی وجہ سے معاملہ اتنے دنوں تک تھا رہا۔ ورنہ جانے کتنے سر بھرے سیاح اب تک نیچے اتر چکے ہوتے۔“

”آپ کا خیال قطعی درست ہے۔ میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا تھا....!“ فریدی نے سر ہلا کر جواب دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ جنگل کی طرف روانہ ہو گئے.... تقریباً چار فرلانگ کے فاصلے پر زمین کی سطح کچھ اونچی تھی اور یہیں سے جنگلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

”یہ جنگل ایسے کاموں کیلئے بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔“ کرنل داراب نے کہا۔ فریدی کچھ نہ بولا۔ داراب کی اس بات کا جواب اس کے کسی ساتھی نے دیا تھا۔

پھر فریدی اور آصف اس پارٹی سے کچھ پیچھے رہ گئے.... آصف اب سیدھا ہو گیا تھا۔ فریدی جو کچھ بھی کہتا کان دبا کر کرتا۔

”سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ انگوٹھی ہر وقت گیت ہی کیوں سناتی رہتی ہے۔“ اس نے فریدی سے پوچھا۔

”اس کا مصرف ہی یہی ہے۔“ فریدی نے جواب دیا۔ ”اسی نوعیت کے کسی ٹرانسمیشن سسٹم سے کوئی ریکارڈ ایچ ہو گا اور یہ ریکارڈ کئے ہوئے گیت اسی کے ذریعہ اس مخصوص ریسور کے لئے نشر ہوتے ہوں گے ورنہ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہر وقت گاتی ہی رہتی ہوگی۔“

”کیا اس وقت بھی یہی آواز آرہی ہوگی۔“

”یقیناً....!“ فریدی مسکرایا۔ ”کیا سنو آؤں؟ اچھا ٹھہریے۔“

وہ اپنا دایا ہاتھ سر پر پھیرنے لگا۔

دفعۃً آواز آئی۔ ”ورنہ پچھتاؤ گے.... آصف کرنل فریدی کو سمجھاؤ.... یہاں سے چلے جاؤ.... ورنہ پچھتاؤ گے.... آصف کرنل فریدی کو سمجھاؤ.... یہاں سے چلے جاؤ.... ورنہ پچھتاؤ گے.... آصف کرنل....!“

فریدی نے اپنا ہاتھ آصف کے کان کے قریب کر دیا۔ آصف تھوڑی دیر تک سنتا رہا پھر بولا۔ ”تمہارا یہ خیال بھی درست ہی نکلا کہ دوسری طرف ریکارڈ ہے دیکھو نا یہی ایک جملہ با

بولا۔ ”جاؤ.... دفع ہو جاؤ....“ وہ سب سریلی سیٹیوں میں چبھتی ہوئی پیچھے ہٹ گئیں۔

”رحم.... جہاں پناہ.... رحم.... ہمارا قصور....“ سب سے حسین لڑکی دوزانو ہو کر بولی اور پھر حمید نے اُسی پُر اسرار عورت کی آواز سنی جو چاروں طرف سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

”کیوں کیپٹن یہ کیا بدحواسی ہے.... ان بیچاروں کو کیوں سہارا ہے ہو۔“

”انہیں لمبے فراق اور شلواریں پہنا کر بھیجو....!“ حمید تلوار ہلا کر دھاڑا۔ ”مجھے دم کی چھپکلیاں بالکل اچھی نہیں لگتیں....!“

”تمہارے اندر ہزاروں برس پرانی روح معلوم ہوتی ہے۔“ جواب ملا۔

”اچھا لڑکیوں.... اپنا پورا جسم ڈھاک کر اس مسخرے کے سامنے آؤ.... ورنہ یہ سچ سچ قتل عام شروع کر دے گا۔“

لڑکیاں دوڑتی ہوئی ایک درخت سے نکل گئیں۔



وہ ہیلی کوپٹر کے ذریعے وادی میں اتر گئے تھے۔ ان میں آصف اور کرنل فریدی بھی تھے۔ فوجی تحقیقاتی کمیشن دس ممبروں پر مشتمل تھا۔ جس کی قیادت کرنل داراب کر رہا تھا۔ یہ ایک تجربہ کار آفیسر تھا اور ان دنوں ملٹری کی سیکرٹ سروس کا سربراہ تھا۔ وہ اپنے ساتھ ضروری اور جدید ترین اسلحہ جات اور بڑی طاقت والی سرچ لائٹ لائے تھے۔ آصف نے اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں اس نے پچھلی رات چمکدار غبار دیکھا تھا۔

بڑی عجیب وادی تھی۔ ایک جانب ٹیکم گڈھ والے سلسلے کی خشک اور بے آب گیاہ بھوری چٹانیں تھیں اور دوسری جانب گھنا سبز جنگل اور دونوں کے درمیان میں پتھریلی جگہ مسطح زمین تھی۔ اسی مسطح حصے میں ایک جگہ پچھلی رات کو وہ چمکدار غبار نظر آیا تھا جس نے بعد کو اوپر اٹھنے والے منارے کی شکل اختیار کر لی تھی۔

چونکہ اس وقت بھی آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اس لئے انہیں کسی سایہ دار جگہ کی ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے کھلے میدان ہی میں ڈیرہ ڈال دیا۔

کرنل داراب اور فریدی حفاظتی چوکی کے کمانڈر کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔

”پتہ نہیں اس بیچارے کا کیا حشر ہوا ہو۔“ کرنل داراب کہہ رہا تھا۔ ”غالبا اسے غائب کر کے

دہرایا جارہا ہے۔“

”اور مجھے صرف اس کی خوشی ہے کہ ایک بات تو اس آسیب سے پوشیدہ رہ سکی۔“ فریدی نے کہا۔

”کیا....؟“

”یہی کہ وہ انگوٹھی اب میرے پاس ہے۔ آپ کے پاس نہیں.... دیکھئے نا وہ آپ ہی کو مخاطب کر رہی ہے۔“

”گلد....!“ آصف خوش ہو کر بولا۔ ”ہاں یہ بات تو ہے.... مگر تم نے ابھی اپنے سر پر ہاتھ کیوں پھیرا تھا۔“

”اس کے بغیر آواز ہی نہیں نکل سکتی۔ بالوں کی رگڑ سے اس میں ہلکی سی برقی رو پیدا ہوتی ہے اور یہی برقی رو اس آواز کو کچل کر کے ہمارے کانوں تک پہنچاتی ہے۔ جب تک اس میں رو باقی رہتی ہے ہم آواز بھی سنتے رہتے ہیں جہاں ختم ہوئی آواز غائب! ورنہ یہ ریکارڈنگ ہمیں ہر وقت سنائی دیتی رہے۔“

”یار مانتا ہوں.... تم ہر فن مولا ہو۔“

”اوہ ہم بہت پیچھے رہ گئے۔“ فریدی نے کہا اور رفتار تیز کر دی۔

وہ کئی گھنٹوں تک اس جنگل میں بھٹکتے پھرے جب شام ہونے لگی، تو انہوں نے واپسی کا ارادہ کیا مگر تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے محسوس کیا کہ وہ نہ صرف راستہ بھول گئے ہیں بلکہ اب تو سمتوں کا تعین کرنا بھی محال ہو گیا ہے۔ اگر مطلع صاف ہوتا تو غروب ہوتا ہوا سورج ہی ان کی رہنمائی کر سکتا۔

مگر قدرت مہربان تھی۔ کچھ دیر بعد فریدی اس سرے تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی گیا جدھر سے وہ لوگ جنگل میں داخل ہوئے تھے۔ لیکن اپنے مستقر پر پہنچنے کے لئے انہیں چار فرلانگ کی بجائے تقریباً تین میل چلنا پڑا۔ اور اس دوران میں اندھیرا پھیل گیا۔ یہ اندھیرا بھی انہیں بھٹکا دیتا۔ اگر فریدی نے چلنے وقت احتیاطاً ایک نارچ نہ رکھی ہوتی۔ ٹھیک آٹھ بجے وہ اپنے مستقر پر پہنچے تھے۔

انہوں نے ٹھنڈا کھانا کھایا اور بیٹھ رہے.... دراصل وہ اس منارے کو قریب سے دیکھنا

چاہتے تھے اور صحیح اندازہ کرنا چاہتے تھے کہ وہ کس جگہ سے نمودار ہوتا ہے۔

فریدی ان لوگوں سے کچھ دور ہٹ کر بیٹھا تھا اور آصف تو اب اس کے پیچھے لگا ہی رہتا تھا۔ اس وقت وہ بھی کھسکتا ہوا ان لوگوں سے دور نکل آیا تھا اور فریدی کے سر پر مسلط تھا۔

”یاد ذرا پھر گھسوا انگوٹھی۔“ آصف نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”شاید اب کی کوئی جن برآمد ہو کر ہماری مشکل آسان کر دے۔“

”ڈرائی جن....!“ فریدی مسکرایا۔

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے آج تک نہیں پی۔“ آصف بول پڑا۔

وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور اس کا سلسلہ دس بجے تک جاری رہا۔ پھر اچانک انہیں تقریباً سو گز کے فاصلے پر کوئی چمکدار چیز دکھائی دی۔ جو ان اطراف و جوانب میں ہلکی سی روشنی پھیلا رہی تھی۔ لیکن زمین کی سطح سے اونچی نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ اس کی چمک اتنی بڑھ گئی وہ ایک دوسرے کے خدوخال تک بخوبی دیکھ سکتے تھے لیکن دفعتاً انہوں نے ایک آج کی بھی محسوس کی۔

بالکل ایسا ہی معلوم ہوا جیسے کسی بہت بڑی بھٹی کا کوئی در کھل گیا ہوا ہو۔ اور وہ اس سے قریب ہی ہوں۔ یہ آج بھی اسی طرح بڑھ رہی تھی جیسے آہستہ آہستہ اس روشن دھبے کی روشنی تیز ہوتی گئی تھی بلا آخر انہیں بڑی بدحواسی کے عالم میں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ وہ جلد از جلد اس حدت کے حیطہ اثر سے نکل جانا چاہتے تھے انہیں اس کا بھی ہوش نہیں تھا کہ مڑ کر دیکھتے.... کافی دیر تک تیز دوڑتے رہنے کے بعد انہیں اس آج میں کی محسوس ہوئی۔ پھر رفتہ رفتہ انہیں محسوس ہوا جیسے وہ جہنم سے دوبارہ جنت کی طرف پلٹ آئے ہوں۔

وہ رک گئے اور اب انہوں نے مڑ کر دیکھا.... بہت دور روشن منارہ بڑی تیزی سے فضا میں بلند ہو رہا تھا۔

”سوفیہ راکٹ....!“ کرنل داراب بڑبولا۔ ”افسوس سب کچھ وہیں رہ گیا۔“ فریدی کچھ نہ بولا۔

”میں کل وہاں بڑی شدید بمباری کراؤں گا۔ اتنی شدید کہ وہاں غار ہی غار نظر آئیں گے۔“

داراب پھر بولا۔

”میری دانست میں وہ بھی وقت کی بربادی ہی ہوگی۔“ فریدی نے طویل سانس لے کر

کہا۔ ”انہوں نے اسکے امکانات پر بھی نظر رکھی ہوگی اور اس کے خلاف بھی کچھ انتظام کر لیا ہوگا۔“

”مبارک زمین تو ذکر نکلا ہوگا۔“ کسی نے کہا۔

لیکن اس کا جواب فی الحال فریدی کے پاس بھی نہیں تھا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد جب دوبارہ مکمل تاریکی پھیل گئی تو وہ مستقر پر پہنچے یہاں پر ہر چیز جوں کی توں تھی.... پھر ہیلی کوپٹر چنگھاڑنے لگے اور انہیں بے نیل و مرام واپس ہونا پڑا۔

حالانکہ فریدی نے بمباری والی اسکیم کی مخالفت کی تھی لیکن کرنل داراب نے دھیان نہیں دیا۔ دوسرے دن ایک بمبار گر جتا ہوا اودی کی فضا میں تیر ہی گیا لیکن ایک چھوٹا سا راکٹ جنگل کے کسی گوشے سے پرواز کرتا ہوا آیا اور جہاز سے ٹکرا کر اس کے پرچے اڑا دیے۔

”میرے خدا۔“ کرنل داراب کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ چلا۔

”میں نے پہلے ہی آپ کو روکا تھا....“ فریدی نے برا سامنہ بنا کر کہا۔ ”مفت میں ایک ہوا باز کی جان گئی۔ ایک جہاز تباہ ہوا.... وہ ہمارے ہیلی کوپٹر کو بھی فنا کر سکتے تھے۔ لیکن انہیں علم تھا کہ اس طرح ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے میں یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ وہ غیر ضروری کشت و خون سے احتراز کرتے ہیں۔“

”مگر یہ ہیں کون اور یہاں کیا کر رہے ہیں۔“ کرنل داراب نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

”کوئی بھی ہوں.... لیکن ہمیں یہ ضرور دیکھنا پڑے گا کہ ہمیں زیادہ نقصان نہ پہنچے۔ ابھی اس بمبار کے حادثے نے بتا دیا ہے کہ ہم اپنے حربوں سے ان پر قابو نہیں پاسکتے کیونکہ ان کے پاس ایسے جدید ترین ہتھیار ہیں جن کی ہوا بھی ہمیں ابھی نہیں لگی۔“ ان پر موت کی سی خاموشی مسلط ہو گئی۔

وہ کون تھی

حمید نے برا سامنہ بنا کر روٹ بدلی۔ منڈولین کا نغمہ اس کے نیم خوابیدہ ذہن کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا.... مسہری جس کے چاروں طرف ریشمی جالی لٹک رہی تھی کمرے کے ایک گوشے سے نظر آئی.... اور پھر اسے ایک دوسری مسہری بھی دکھائی دی جو پہلے وہاں نہیں تھی غالباً اسی کے لئے اس طرح جگہ نکالی گئی تھی۔

صبح کو وہ اسی طرح جگایا جاتا تھا! منڈولین پر کوئی دھن بجائی جاتی تھی اور وہ بیدار ہو جاتا تھا۔ بالکل شاہانہ ٹھاٹھ تھے۔

منڈولین کا گیت ختم ہوتے ہی اس نے خرائے سے جو کبھی ہلکے ہو جاتے تھے اور کبھی بھاری.... ریشمی جالی کی پھردانی ہٹا کر وہ نیچے اتر آیا.... زرکار چپلیں سلیقہ سے رکھی ہوئی تھیں ان میں پیر ڈال کر وہ دوسری مسہری کی طرف بڑھا۔

”ارے....!“ اس کی زبان سے بیساختہ نکلا۔ وہ تو قاسم تھا۔ یہ یہاں کیسے پہنچا.... کیا کرنل بھی پکڑ لئے گئے؟ یک وقت کئی سوال اس کے ذہن میں چکرانے لگے۔ اس نے پھردانی اٹھائی اور قاسم پر ٹوٹ پڑا۔

”آغے باپ رے....!“ وہ آنکھیں بند کئے ہوئے چیخا۔ پھر اسی طرح حمید کو ٹٹولنے لگا۔ آنکھیں کھولیں پھر بولا۔ ”ہائے جیسا ڈارلنگ آخر تمہیں مجھ پر رحم آ ہی گیا۔ اور پھر آنکھیں بند کئے ہی ہوئے حمید کے سر پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ نہ جانے وہ آنکھیں کیوں نہیں کھول رہا تھا۔ ”ہائیں.... ارے باپ رے....!“ وہ پھر دہاڑا۔ ”میزی آنکھیں کیوں نہیں کھلتیں.... جیسا ڈارلنگ۔“ حمید جو اس پر لدا ہوا تھا چونک کر اس کی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا.... دوبار ایک جھلیاں سی اس کی دونوں آنکھوں پر چپکی ہوئی تھیں۔

حمید نے انہیں ادھیڑنے کی کوشش کی اور وہ نکلتی چلی آئیں۔

”اب خول دوں۔“ قاسم نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”ہاں گدھے ڈارلنگ....!“ حمید نے جواب دیا۔

”ارے.... ارے.... توں.... اف.... فون.... ارے تم....!“ قاسم کی آنکھیں نہ صرف کھل گئی تھیں بلکہ ان کا پھیلاؤ دیکھنے کے قابل تھا۔ حمید نے سوچا کہ اب یہ دیو اچھلے گا لہذا چپ چاپ ہٹ جاؤ.... اس کا خیال غلط نہیں نکلا۔ اس کے بٹنے ہی قاسم نے ایک چنگھاڑ ماری اور سکری سے اچھل کر دھپ سے فرش پر آ رہا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا تھا۔ بری طرح کانپ رہا تھا اور زبان سے بے تکلفاظ نکل رہے تھے۔

”مم.... مم.... بب.... بب.... بچاؤ.... میں.... کھوپڑی میں گھس گیا ہوں۔“ پھر حلق پھاڑ کر دہاڑا۔ ”ارے بچاؤ.... نکالو.... کھوپڑی سے۔“

اب حمید کو یاد آگیا کہ جس وقت وہ کرنل وارڈ کے خیمے میں بچن گارہا تھا فریدی کے ساتھ قاسم بھی آیا تھا۔ مگر کھوپڑی.... یہ کھوپڑی میں گھسنا کیا بلاتا تھا۔

”اے.... اولمڈ ہیگ خاموش ہو جاؤ.... ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔“
 ”ارے حمید بھائی مجھے بچاؤ.... میں بھی کھوپڑی میں گھس گیا ہوں۔“
 ”کیسی کھوپڑی۔“

”جس میں تم گھس گئے تھے.... یہ کھوپڑی ہی تو ہے۔“

”اے آلو.... یہ ہمارا محل ہے۔ ہم یہاں کے شہنشاہ ہیں۔ سیدھے کھڑے ہو۔ کورنش بجالاؤ۔“

قاسم بوکھلا کر اٹھ بیٹھا.... اور پھر بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ہائیں.... حمید بھائی.... یہ تمہارا لباس کیسا ہے؟“

حمید کے جسم پر ”ہالی ووڈ مارکہ بغدادی سلطان“ کا لباس تھا۔

”لباس شاہانہ.... کھڑے ہو جاؤ.... اور کورنش بجالاؤ....!“

”کورنش.... کورنش تو نہیں ہے میرے پاس۔ منگوادو۔ بجا کر رکھ دوں گا کورنش کیا ہوئی ہے حمید بھائی!“

”جھک کر سلام کرنے کو کورنش کہتے ہیں۔ موٹی عقل والے.... ہمیں جہاں پناہ کہو۔“

”اے کیوں مذاق کرتے ہو۔“ قاسم بے ڈھنگے پن سے ہنسا۔

حمید نے تین بار تالی بجائی اور دو نیم عریاں لڑکیاں اندر داخل ہو کر آداب بجالائیں۔ ”حمام تیار کیا جائے۔“ حمید نے اکڑ کر کہا۔

وہ پھر جھکیں اور اٹھنے قدموں واپس چلی گئیں۔

قاسم کھڑا حیرت سے پلکیں جھپکاتا رہا۔ پھر ہونٹ چاٹتا ہوا بولا۔ ”ارے واہ پیارے حمید بھائی یعنی کہ بی بی بی بی.... اُف فوہ۔“

”حمید بھائی نہیں جہاں پناہ....!“

”اچھا بے جہاں پناہ.... ٹھیکے کی نہیں تو....!“ قاسم جھلا گیا۔ ”چار دن سے سالے جہاں

پناہ ہو گئے ہیں تو مجاز ہی نہیں ملتے.... ارے ہاں۔“

وہ دونوں ضروریات سے فارغ ہوئے غسل کیا.... پھر ناشتے پر جم گئے۔ چاروں طرف، لڑکیاں ہی لڑکیاں موجود تھیں اور قاسم دل کھول کر کھارہا تھا۔

ناشتے کے بعد در و دیوار سے سازوں کی آوازیں آنے لگیں اور لڑکیوں نے رقص کرنا شروع کر دیا۔

”واہ پیارے جہاں پناہ.... بھائی! ارے باپ رے میں کیا کروں۔“ قاسم بے چینی سے پہلو بدلتا ہوا بڑبڑایا۔

”ان میں سے کسی ایک کو پسند کر لو....“ حمید نے لا پرواہی سے کہا۔

”اچھا اچھا.... وہ.... نہیں وہ.... انہوں.... وہ بھی نہیں.... وہ جو ادھر ناچ رہی ہے.... ارے باپ رے یہ تو اس سے بڑی زیادہ حسین ہے نہیں یار حمید بھائی.... اوغ اوغ....“

جہاں پناہ میری سمجھ میں نہیں آتا.... ارے سبھی تو گنگڑی ہیں.... ارے پیارے۔“ وہ یک بیک حمید سے لپٹ گیا اور حمید کو اپنی ہڈیاں کڑکڑاتی محسوس ہونے لگیں۔

”اُغے.... اُغے.... حمید بھائی۔“ وہ دانت پر دانت جھمکے کہہ رہا تھا۔

”میں قیاقرون.... میں مرجاؤں غا! ہائے پیارے جہاں پناہ مری جان!“

ساتھ ہی قاسم کی گرفت بھی تنگ ہوتی جا رہی تھی اور حمید کا دم گھٹ رہا تھا۔

”اے چھوڑو! ادا تھی کے بچے.... چھوڑو!“ اس نے قاسم کی کھوپڑی پر دو ہتھوڑ چلائے۔ ”اے

ہٹ ورنہ میں ابھی انہیں حکم دیتا ہوں یہ اپنے سینڈل اتار کر تجھ پر پیل پڑیں گی۔“

قاسم نے بوکھلا کر اُسے چھوڑ دیا اور کھسیانی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ”ناف کرنا حمید بھائی سالہا دماغ الٹ پلٹ جاتا ہے۔“



آصف نے رات حفاظتی چوکی پر بسر کی تھی۔

صبح اٹھ کر وہ قاسم کے خیمے کی طرف روانہ ہو گیا۔ تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ اس نے زیبا کو دیکھا جو بڑی بدحواسی سے اسی طرف بھاگی آرہی تھی۔

”اوہ.... سیٹھ جی.... سیٹھ جی۔“ وہ دور ہی سے چلائی۔

آصف بھی تیزی سے قدم اٹھانے لگا تھا۔

”سینٹھ... موٹے صاحب غائب ہیں۔“ زبیا نے چیخ کر کہا۔

”جنم میں جائے۔“ آصف بڑبڑایا۔

”ارے سنئے تو سہی! میں صبح سو کر اٹھی تو وہ غائب تھے۔ کچھ دیر انتظار کرتی رہی جب نہیں آئے میں انہیں شانہ میں دیکھنے لگی۔ لیکن وہ وہاں بھی نہیں ملے۔ واپسی میں خیمے کی پشت پر نکل آئی۔ یہاں ایک چھوٹے سے غار میں ان کے جوتے پڑے دیکھے۔“

”تو پھر میں کیا کروں۔“ آصف جھنجھلا کر بولا۔ ”میرے کان نہ کھاؤ! مجھے اب تم سے یا اس سے کیا سروکار۔“

”میرے خدا اب میں کیا کروں؟“

”تم نے ایسی ہی مکاری کی باتیں مجھ سے بھی کی تھیں۔ تم فراڈ ہو میں تمہیں جیل بھجواؤں گا۔“

”نہیں... نہیں۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ”میں ایک غریب لڑکی ہوں۔ آپ ہی لوگوں سے میری روزی چلتی ہے۔ آپ نے کیوں کہہ دیا تھا کہ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔“

”ختم کرو!“ آصف ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”جاؤ یہاں سے اور اس خیمے سے اپنا سامان اٹھا لے جاؤ۔“

ایک بیک زبیا بھی بگڑ گئی ”خیمہ موٹے صاحب کا ہے اور میں ان کی سیکریٹری ہوں، ان کی عدم موجودگی میں کوئی ان کے خیمے میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا۔ آپ جیل وغیرہ کی دھونس کی جاہل کو دبیجئے گا سمجھے۔“

”ہٹو سامنے سے۔“ آصف دھاڑا۔ لیکن ٹھیک اسی وقت اُس نے قہقہے کی آواز سنی اور یہ آواز اُسی پُر اسرار عورت کی تھی۔

”آصف صاحب... میری بھی سنئے۔ آواز کی طرف چلے آئیے۔ ڈریئے نہیں۔ میں صرف چند باتیں کروں گی جو آپ کے لئے بھی مفید ہوں گی۔ آئیے ڈریئے نہیں۔“

آصف کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ لیکن پھر زبیا کی موجودگی کا خیال آتے ہی وہ تن گیا اور زبردستی آواز میں بھاری پن پیدا کر کے بولا۔ ”میں ڈروں گا کیوں؟ آ رہا ہوں۔“

یہ آواز ایک سوراخ سے آرہی تھی۔

”ہاں! کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔“ آصف نے کہا۔

”کرتل کو سمجھاؤ۔ میں پچھلی رات بھی تمہیں پیغام دیتی رہی ہوں۔ دیکھو میں کسی کو بھی

کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتی ایک کام کر رہی ہوں۔ اس کے اختتام پر یہاں سے چلی جاؤں گی کیا تم مجھے جانتے ہو۔“

”نہیں... میں نہیں جانتا۔“

”کرتل جانتا ہے کیونکہ وہ بھی میری ہی طرح کوئی معمولی آدمی نہیں ہے... وہ کہاں مل سکے گا۔ آصف صاحب۔“

”مجھے علم نہیں ہے۔ بہر حال پچھلی رات وہ کمیشن کے چند ممبروں کے ساتھ کہیں گیا ہے۔“

”خیر... مجھے صرف اتنا ہی کہنا تھا کہ وقت نہ برباد کرو۔ میں آسیب نہ سہی! پھر بھی تم لوگوں کے لئے آسیب ہی ثابت ہو سکتی ہوں... پتہ نہیں کتنی بار میں تمہیں ختم کر سکتی تھی۔“

”پھر کیوں نہیں ختم کر دیا۔“

”اس امید پر کہ ہو سکتا ہے کبھی تم میرے کام آسکو...!“

”یاد دوسرے الفاظ میں ملک و قوم سے غداری کر سکو۔“

”ہر چیز سے متعلق نظریات بدلتے رہتے ہیں۔ کل ایک ہی چیز کے متعلق تمہارا کچھ خیال تھا آج کچھ ہے اور کل دونوں ہی سے مختلف ہو گا۔“

”مگر تم نے مجھے روکا کیوں ہے۔“

”محض یہ بتانے کے لئے میرے خلاف تمہاری کوئی بھی حرکت بہت بڑی تباہی لاسکتی ہے اور تمہارے ڈیڑھ ہزار آدمیوں کا خون خود تمہاری گردن پر ہو سکتا ہے حمید اور قاسم کو بھی انہیں میں شامل سمجھو۔ کل اپنے بمبار کا حشر دیکھ چکے ہو! ہمارے ایک معمولی سے خود کار راکٹ نے اُسے تباہ کر دیا تھا۔ مفت میں ایک آدمی کی جان ضائع ہوئی... یا اس پر دو ہوا باز تھے۔“

”مجھے علم نہیں ہے۔ مگر پھر تمہارے آدمیوں نے دو فوجیوں کو کیوں مار ڈالا تھا۔“

”وہ مجبور نہ تھے۔ اگر انہوں نے ریوالور نہ نکالے ہوتے تو وہ بھی معاف کر دیئے جاتے۔“

”تم یہاں کیا کر رہی ہو۔“

”یہ شاید تمہیں کبھی نہ معلوم ہو سکے۔“

”مگر اسے بھی یاد رکھو کہ فریدی صرف ایک آنکھ سے پوری نیند لے سکتا ہے۔“

”میں جانتی ہوں کہ وہ دنیا کا چالاک ترین آدمی ہے لیکن... خیر ہٹاؤ۔ تم نہیں سمجھ سکو گے

میں اب کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ میری باتوں میں اگر کچھ وزن نظر آئے تو ان پر عمل کرنے کی کوشش ضرور کرنا۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔ پھر کبھی۔۔۔۔۔!“

آواز آتی بند ہو گئی۔ آصف زیبائی کی طرف مڑا۔ جو قریب ہی کھڑی بڑی طرح کانپ رہی تھی۔
”ساتم نے۔۔۔۔۔!“ قاسم بھی وہیں پہنچ گیا ہے۔ ”اب تم چپ چاپ چھوری پیک کا راستہ لو۔“
”ناممکن ہے۔ جناب میں ان کا سامان ان کے سپرد کر کے ہی جاسکوں گی۔“

”جنم میں جاؤ۔۔۔۔۔!“ آصف نے کہا اور پھر چوکی کی طرف پلٹ گیا۔ نہ جانے کیوں اب وہ زیبائے دور ہی رہنا چاہتا تھا۔ عشق کا بھوت تو اسی دن اتر گیا تھا جب فریدی نے ”ازراہ خودری“ اُسے چند نصیحتیں کی تھیں۔



زہرہ ہفت افلاک۔۔۔۔۔ اس وقت گوشت پوست میں حمید کے سامنے کھڑی تھی۔ لیکن اس کے گرد فرش پر ایک چمکدار حصار تھا۔ اتنا چمکیلا کہ پٹری میکس لیمپوں کی روشنی میں بھی اس کا چمک الگ ہی نظر آرہی تھی۔۔۔۔۔ وہ دونوں اس کمرے میں تنہا تھے۔ حمید سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ ایک ہی جست میں اس تک پہنچے اور اس کا گلا گھونٹ کر پھر اپنی جگہ پر واپس آجائے لیکن وہ حصار کیسا تھا۔

”کیوں کیپٹن خاموش کیوں ہو۔“ اس نے مسکرا کر پوچھا۔

”میں اس وقت سوچ رہا ہوں کہ اپنا تیل انڈے دیتی ہے یا بچے۔“

”نہیں تم بھول رہے ہو۔“ وہ مسکرائی۔ ”تمہارے لاشعور میں دراصل چمکاوڑ ہے اور ساتھ ہی تم یہ بھی سوچ رہے ہو کہ میرا خاتمہ کر دو۔۔۔۔۔ لیکن اچھے دوست اس حصار میں داخل ہونا موت ہی کو دعوت دینا ہوگا۔ یہ دیکھو۔“

اس کے ہاتھ میں لوہے کا ایک رول تھا اس نے اُسے حصار کے باہر پھینکا لیکن وہ حصار سے گزرنے کی بجائے چمکدار لکیر پر آتے ہی ریزہ ریزہ ہو کر چاروں طرف بکھر گیا۔

”یہ تو لوہا تھا کیپٹن حمید۔۔۔۔۔ آدمی اگر گزر جانا چاہے تو اُسے قیہ کہیں گے۔“

”مگر تم نے اس وقت مجھے شربت دیدار پلایا ہے۔۔۔۔۔ دیے اگر فالودہ ہوتا تو اس سے بھی اچھا تھا۔“

”فضول باتیں چھوڑو! یہ بتاؤ کہ میں کون ہوں۔“

”جیلانی کی محبوبہ۔“ حمید نے لا پرواہی سے جواب دیا۔

”بکو اس! یہ جیلانی ہی تو میرے لئے مصیبت کا باعث بنا ہے۔ درنہ فریدی کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوتی کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ واضح رہے ہم یہاں تین سال سے کام کر رہے ہیں۔“
”کیا کام کر رہی ہو۔“

”یہ نہیں بتایا جاسکتا۔ ہاں تو جب اس جیلانی کی بنائی ہوئی تصویر آرٹ گیلری میں لگائی گئی تو مجھے بھی اس کی اطلاع ہوئی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ تصویر کے ساتھ ہی ساتھ اس کی آسیب والی کہانی بھی شہرت پارہی تھی۔ مجھ سے اور کرئل وارڈ دونوں ہی سے حماقتیں سرزد ہوئیں۔ میں جیلانی کو دیکھنے اس کے گھر دوڑی گئی میں دیکھنا چاہتی تھی کہ آخر وہ ہے کون وہ نہیں ملا تھا لیکن میں نے اس کے گھر پر اس کی تصویر دیکھی تھی۔ لیکن میری یادداشت میں ایسا کوئی آدمی نہیں تھا پھر اس تصویر کا کیا چکر تھا نہ کبھی میں نے اُسے دیکھا اور نہ اس نے مجھے دیکھا۔ پھر وہ تین سال تک صرف میری ہی تصویر کیسے بناتا رہا۔ کرئل وارڈ سے یہ حماقت سرزد ہوئی کہ اس نے اس تصویر کے نیلام میں حصہ لے لیا اور بولی بڑھاتا گیا۔ اُسے علم نہیں تھا کہ کرئل فریدی بھی وہ تصویر دیکھ کر چونک پڑا ہے اور میں ابھی اس سے بے خبر تھی کہ اس تصویر کے گرد کرئل فریدی کا جاگتا ہوا ذہن کوئی جال بن رہا ہے۔ تصویر کا نیلام اس کے اشارے پر ہوا تھا۔“

”کچھ بھی ہو۔“ حمید بولا۔ ”تصویر ہوتی یا نہ ہوتی لیکن چمکدار دھوئیں کا منارہ ہمیں لامحالہ اپنی طرف متوجہ کر لیتا۔“

”کچھ بھی نہ ہوتا۔۔۔۔۔ لاکھ متوجہ ہوتے۔۔۔۔۔ کل رات کیا ہوا آپ کے فریدی صاحب اترے تھے وادی میں لیکن منارہ بننے سے پہلے وہ جگہ جنم بن گئی اور انہیں میلوں دور بھاگ کر دم لینا پڑا۔۔۔۔۔ پھر فوجی تحقیقاتی کمیشن کے ایک کرئل صاحب کے مشورہ سے وادی پر وزنی بم گرانے کا پروگرام طے پایا۔ لہذا آیا ایک بمبار گر جتا ہوا آیا۔ لیکن جنگل سے چلنے والے ایک خود کار راکٹ نے اس کے پر خچے اڑا دیے۔ نہیں کیپٹن تم کبھی کامیاب نہ ہوتے۔ لیکن کرئل فریدی کو نانوتہ کے طریق کار کا علم ہے۔“

”تم نانوتہ ہو۔۔۔۔۔!“ حمید یک ایک اچھل پڑا۔ ”تھریسیا بمیل بی آف بوہیمیا کی ساتھی۔“

”دنیا میں اس وقت دو ہی عورتیں تو ہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”تم کس ملک کے لئے کام کر رہی ہو۔“

”اب کیا یہ بھی بتانے کی ضرورت رہ جاتی ہے۔ زیرولینڈ کا نام تو کم از کم تم لوگوں کے لئے راز نہیں رہا۔ تم نے تاریک وادی میں بھی ہمیں بڑا نقصان پہنچایا تھا۔ ہم جب چاہیں تم لوگوں کا خاتمہ کر دیں لیکن ہم سوچتے ہیں کہ ایک دن تمہیں بھی زیرولینڈ کا شہری بننا ہے۔ پھر ہم کیوں اتنے ذہین آدمیوں کا خون بہائیں۔ تمہیں یہاں اس لئے نہیں لایا گیا کہ میں تم پر عاشق ہو گئی ہوں۔ نہیں ہو سکتا ہے کہ تم یہی سوچ رہے ہو۔ تم اس لئے لائے گئے ہو کہ میں تمہیں اپنے ساتھ زیرولینڈ لے جاؤں فریدی بھی آج ہی کل میں بندھا چلا آئے گا اور ہم جلد ہی یہاں سے کوچ کر دیں گے کیونکہ ہمارا کام قریب قریب ختم ہو چکا ہے۔“

”وہاں شادی ہو سکے گی میری۔“ حمید نے خوش ہو کر پوچھا۔

”خواہ مخواہ مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔“ نانوتہ بڑا سامنے بنا کر بولی۔ اچانک دو آدمی داخل ہوئے جو کرنل وارڈ کو گھسیٹتے ہوئے لارہے تھے۔ کرنل وارڈ کا لباس تار تار تھا اور جسم پر کئی جگہ گہری خراشیں تھیں جن سے خون بہہ رہا تھا۔

”کیوں کرنل وارڈ! تم یہاں کیسے۔“ نانوتہ نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”پھر کیا میں خود کو فریدی کے شکاری کتوں سے نچوڑاؤں۔“ کرنل وارڈ نے ہانپتے ہوئے کہا۔
”وہ مجھے پاتال میں بھی نہ چھوڑے گا۔ میں نے پہلے ہی آپ کو مشورہ دیا تھا کہ ابھی کیپٹن حمید کو آزاد ہی رہنے دیجئے۔“

”میں پوچھتی ہوں تمہیں راستہ کیسے معلوم ہوا۔“ اس نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

”اوہ.... مادام! کیا اب میں اتنا بھی نہ جانوں گا جب کہ ہزاروں میرے ہی توسط سے یہاں تک پہنچے ہیں۔“

”تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اپنے کام سے کام رکھنے کی بجائے میری ٹوہ.... میں رنجے تھے۔ جانتے ہو اس کی سزا کیا ہو سکتی ہے۔“

”رحم.... رحم.... مادام....!“ وہ گھٹنوں کے بل گر کر گڑ گڑایا۔ نانوتہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہی پھر اپنے دو آدمیوں سے نرم لہجے میں کہا۔ ”یہ بھی مہمان خصوصی ہیں۔ نمبر آٹھ میں ان کے لئے انتظام کرو۔“

وہ دونوں زخمی کرنل وارڈ کو وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔

”فریدی کہاں ہے۔“ نانوتہ نے اس سے پوچھا۔

”کل رات وہ ٹیکم گڈھ گیا تھا مادام اور آج پھر واپس آ گیا اور اس وقت اس کے شکاری کتے چاروں طرف میری بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔“

”تم کہاں تھے کل سے اب تک۔“ نانوتہ نے سوال کیا۔

”یہ نہ پوچھئے نہ جانے کہاں کہاں چھپتا پھرا ہوں۔“

”گڈھے.... اگر تمہارے پیچھے وہ بھی لگا چلا آیا ہو تو۔“ نانوتہ نے کہا اور کچھ سوچنے لگی۔
لیکن کرنل وارڈ دم بخود ہی رہا۔

آخری حادثے

”ہائے.... جیسا ڈارلنگ....!“ قاسم اوندھا پڑا ہوا سسکیاں لے رہا تھا۔ ”تمہیں کہاں ڈھونڈوں.... تم نے کہا تھا کہ آنکھیں بند کر لو.... تب ہی دل کی آنکھیں کھلیں گی.... میں نے آنکھیں بند کر لیں.... اور تم گائب ہو گئیں۔ اب میں تمہیں کہاں تلاش کروں.... تم کتنی اچھی ہو.... میرا سر دکھ رہا تھا.... تم نے ہولے ہولے میرا سر دبا دیا تھا.... ہائے آج تک کسی سال میں میرا سر نہیں سہلایا۔ اُس آلو کی پٹھی نے بھی نہیں جسے لوگ.... میری جورو کہتے ہیں۔“

”ایک بیک قاسم! اچھل کر بیٹھ گیا اور سامنے والی دیوار کو گھونسنہ دکھا کر کہنے لگا۔“ ایسی جورو کو تڑپ تڑپ کر مرنے چاہئے.... مر مر کر تڑپنا چاہئے، آلو آلو کی پٹھی میری چھاتی پر چڑھی بیٹھی ہے.... اتر.... اتر.... میں جیسا سے شادی کروں گا.... تجھے تھلاں دوں گا.... ہائے وہ تاجک تاجک ہاتھ.... ہائے وہ لمبی لمبی انگلیاں.... جیسا.... میں مر جاؤں گا.... او۔“

حمید کو ہنسی آگئی وہ دیر سے درتچے میں کھڑا اس کی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔

قاسم جھلا کر مڑا اور غصیلے انداز میں اس نے بھی دانت نکال دیئے۔

”نہی ہی ہی!.... بس ہنسا کرو اور کیا آتا ہے تمہیں.... دوسرے سالے آلو کے پٹھے ٹیل.... وہ رونا چاہیں تو تم انہیں رونے بھی نہ دو۔“

کتنا پیار تھا۔۔۔ ہائے میں کیا کروں۔“

قاسم کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

حمید نے بڑے پیار سے دو چار بار اس کا سر سہلایا اور آنسو گالوں پر ڈھلک آئے۔

”میں اُسے تلاش کروں گا۔“ حمید نے کہا۔ ”ہاں تو پھر کیا ہوا تھا۔“

قاسم نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے اور غصیلی آواز میں بولا۔ ”پھر سالے مجھ میرے

کانوں میں جھنجھٹانے لگے۔ میں نے انہیں تھپڑ مارنے شروع کر دیئے۔ اور حمید بھائی بس میں

گائب ہو گیا۔۔۔ ہائے حیدر ڈار لنگ میں تمہیں کہاں ڈھونڈوں۔“

”غائب ہو گئے۔۔۔ میں نہیں سمجھا۔“

”ٹھیک سے نہیں سمجھے۔۔۔!“ قاسم جھلا کر بولا۔ ”اُسے تم بھیجا چاٹ ڈالتے۔۔۔ جاؤ نا اپنی

لوٹریوں سے دل بہلاؤ جا کر۔۔۔!“

”بس اتنا بتادو کہ غائب کیسے ہو گئے تھے۔“

”مجھے یاد نہیں! میں نہیں جانتا۔۔۔ آنکھ یہاں کھلی تھی۔۔۔ تم نے کھولی تھی۔ بھاگ

جاؤ۔۔۔ میں اس وقت جیسا کو یاد کر رہا ہوں۔“

”زیبا بھی نہیں کہیں قید ہو گی۔“ حمید نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر تم اس کی رہائی چاہتے ہو تو

سنجیدگی سے میرا ساتھ دو۔۔۔ جو کچھ میں کہوں وہی کرو۔ یہ تہہ خانے ہیں ان سے نکلنا آسان کام

نہ ہو گا۔ تمہیں پہاڑوں کی وہ کچھائیں یاد ہی ہوں گی جن سے ہم برف کے بھوتوں والے کیس

میں دوچار ہوئے تھے یہ بھی اسی قسم کی قدیم کچھائیں ہیں جنہیں اس خطرناک عورت نے

دریافت کیا ہے۔“

”پھر بتاؤ میں کیا کروں۔“

”دماغ ٹھنڈا رکھو اور میرا ساتھ دینے کے لئے تیار رہو۔“

دفتیانو تہ کے قہقہے کی آواز گونجی اور وہ دونوں چونک کر خاموش ہو گئے۔

”جہاں پناہ۔“ نانوتہ کا لہجہ طنزیہ تھا۔ ”اگر سازشوں سے فرصت مل گئی ہو تو ذرا حرم سرائیک

آنے کی زحمت گوارا فرمائیے۔ آپ کیلئے ایک تھنڈا حاضر ہے۔ آپ دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔“

”اُسے باپ رے۔۔۔!“ قاسم بوکھلا کر بولا۔ ”سن لیا سالی نے۔۔۔ ارے ب۔“ اس نے

”گھبراؤ نہیں۔۔۔“ حمید سنجیدگی سے بولا۔ ”اتنی لڑکیاں ہیں یہاں کسی کو پسند کر لو۔“

”نہیں قرنا۔“ قاسم حلق پھاڑ کر دہڑا۔ ”وہ سالیاں مجھ پر ہنستی ہیں میرا مذاق اڑاتی ہیں

ٹھیکے پڑ ہیں۔۔۔ ہاں۔۔۔ میں بھی لعنت بھیجتا ہوں۔۔۔ جیسا فرشتہ ہے۔۔۔ جب میں نے اسے

اپنی دکھ بھری کہانی سنائی تھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ ہائے۔۔۔ جیسا۔۔۔

نہیں اس سالی جبرہ ہفت افلاک نے اُسے کہاں پھینکا۔“

”بیٹا پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہارے دل کی آنکھیں کیسے کھلی تھیں! یہ تم نے آج تک نہیں

حالا نکہ آج تمہیں یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔“

”نہیں بتاؤں گا۔۔۔ ورنہ تم جیسا ڈار لنگ پر شک کرو گے! میں جانتا ہوں سالے جہاں پناہ

بھائی تم اور کرغل صاحب بہت شکی ہو۔۔۔ بجز اس بات پر شک۔۔۔ ایسی کی تھی!“

قاسم بُرا سا منہ بنا کر خاموش ہو گیا۔

”تم سمجھے نہیں پیارے۔۔۔!“ حمید نے سنجیدگی سے کہا۔ ”دل کی آنکھیں صرف وہی

کھولتی ہے جو واقعی محبت کرتی ہے۔“

”کرتی ہے نا۔۔۔!“ قاسم خوش ہو کر بولا اور خوشی کا مظاہرہ کرتا ہی رہا ”ہی۔۔۔ ہی۔۔۔“

”ہی۔۔۔ ہی۔“

”مگر حمید۔“ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”ہر لڑکی کا طریقہ الگ ہوتا ہے! میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ

نے کون سا طریقہ اختیار کیا تھا۔“

”ہائے جہاں پناہ بھائی کیا بتاؤں۔۔۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ مجھ سے محبت کرو ورنہ

مر جاؤں گا۔۔۔ اس نے کہا تم خود ہی کرو نا مجھے کیا پڑی ہے میں نے رو کر کہا تھا کہ مجھے محبت

نہیں آتا۔ اس نے کہا میں سکھاؤں گی۔۔۔ دل کی آنکھوں خولو۔۔۔ محبت ہو جائے گی۔ میں

کیسے خولوں مجھے یہ بھی نہیں آتا۔“

اس نے کہا ایک گھنٹے تک آنکھیں بند رکھو۔ میں نے کوشش کی مگر یہ سالی آنکھیں

کھل جاتی تھیں۔ آخر اس نے کوئی چیز اوپر چپکادی۔ پھر سالیاں کھل ہی نہ سکیں۔ اس نے کہا

چلو چل کر ٹھنڈی ہوا میں بیٹھیں خیمے کے پیچھے۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور خیمے کے

لائی۔۔۔ وہاں بیٹھ کر ہولے ہولے میرا سر سہلانے لگی۔۔۔ ہائے حمید بھائی۔۔۔ کتنا پیار تھا

دونوں ہاتھوں سے منہ دبا لیا۔

”میں آ رہا ہوں۔“ حمید نے سخت لہجہ میں کہا اور قاسم کو وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کرتا ہوا درتچے سے گزر گیا۔

حرم سرا والے حصے تک پہنچنے میں اُسے دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے! وہ ان تہہ خانوں میں آزادانہ چل پھر سکتا تھا۔ لیکن آج تک باہر نکلنے کا راستہ نہیں ڈھونڈ سکا تھا۔ حالانکہ اس نے کوشش کی تھی۔ آج اُسے یہاں آئے ہوئے آٹھواں دن تھا۔ اس کا اندازہ اس نے اپنی گھڑی سے لگایا تھا۔ ورنہ یہاں سورج تو دکھائی نہیں دیتا تھا کہ دن اور رات کا اندازہ کیا جاسکتا۔ یہاں تو ہر وقت موسمی شمعیں پائرو میکس روشن رہتے تھے۔ نانوتہ نے حمید کو بتایا تھا کہ وہ باقاعدہ برقی روشنی کا انتظام بھی کر سکتی تھی لیکن چونکہ قیام عارضی ہے اس لئے زیادہ پھیلاؤ پسند نہیں کرتی۔ وہ دیزل پردہ ہٹا کر حرم سرا میں داخل ہوا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں ایسا محسوس ہوا جیسے سر پر بجلی گری ہو۔ وہ ایک جھپٹکے کے ساتھ رک گیا۔

سامنے ہی فریدی سر جھکائے کھڑا تھا اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں اور پیروں میں بیڑیاں لباس تار تار تھا۔ خشک بال گردے الٹے ہوئے تھے اور آنکھوں کے گرد حلقے نظر آ رہے تھے۔ شیو بڑھا ہوا تھا۔

دوسری طرف نانوتہ کھڑی فاتحانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔ اس کے گرد چمکدار حلقہ تھا اور اس کے قریب ہی حلقہ سے باہر کرنل وارڈ تھا ہوا کھڑا تھا۔

”کیپٹن حمید.....!“ نانوتہ نے کہا۔ ”میں اس شاعر کا کلام سننا چاہتی ہوں لیکن اس نے چپ رہنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ اب تم بھی کوشش کرو۔“

”نانوتہ.....!“ دفعتاً حمید پھٹ پڑا۔ ”اس حصار سے باہر آؤ۔ پھر میں دیکھوں۔“

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ غصے سے بڑی طرح کانپ رہا تھا اور حلق میں سانسیں گھٹتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ نانوتہ نے تہقہہ لگایا اور بولی۔ ”نہیں کیپٹن حمید..... میں بڑی نامرد ہوں۔ تم دیکھ رہے ہو! یعنی کہ عورت ہوں..... چوڑیاں پہنتی ہوں..... مجھے تاؤ نہیں آئے گا۔ میں حصار کے اندر رہوں گی کیونکہ مجھے اپنے آدمیوں پر بھی اعتماد نہیں ہے۔ جب میں سوتی ہوں تب یہ حصار میری مسہری کے گرد قائم رہتا ہے، اسے دنیا کی کوئی چیز عبور نہیں کر سکتی۔ اس کا راز

یہاں میرے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا..... کرنل وارڈ..... کیپٹن حمید کو ریوالور دو تاکہ یہ مجھ پر فائر کر سکے۔“

”ادام آپ حصار کے اندر ہیں..... لیکن میں.....“ کرنل وارڈ نے کچھ اور بھی کہنا چاہا لیکن نانوتہ جلدی سے بولی۔ ”خیر جانے دو! میں تو اسے یہ دکھانا چاہتی تھی کہ ریوالور کی گولی بھی اسے نہیں کر اس کر سکتی اس کے قریب آتے ہی پگھل کر نیچے گر جائے گی۔ ہاں تو کیپٹن حمید اب میرا کام مکمل ہو گیا ہے۔ میں تم لوگوں کو زیر ولینڈ لے جاؤں گی۔ کرنل فریدی کو کسی چوہے کی طرح پکڑ لیا ہے..... مگر کتنی دقتوں سے۔ پانچ دن تک میرے آدمی اس کے لئے سرگرداں رہے ہیں۔ یہ میرا کتنا بڑا کارنامہ ہے کہ خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر میں کرنل فریدی کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئی اور تمہارے ملک کی ایک بڑی دولت اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں ساری دنیا پر ہم زیر ولینڈ داؤں کا حق ہے۔ کیونکہ ہم ساری دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ موناخصویت سے میرے کام آئے گا۔ زیر ولینڈ کے بہترین سائنس داں اس کی ذہنی حالت ٹھیک کرنے کی کوشش کریں گے.....“

اور پھر یہ زہرہ ہفت افلاک کے جلاد کا رول ادا کرنے کے لئے بہت مناسب ہو گا۔ اکثر دنیا کے گئے جنگلوں میں مجھے کام کرنا پڑتا ہے۔ وہاں جنگلوں کو ڈرانے کے لئے میں اسے دیو بناؤں گی۔ یہ خاص الخاص تھو میرے ہاتھ لگا ہے۔ اس کے لئے میں تم لوگوں کی شکر گزار ہوں۔“

حمید نے فریدی کی طرف دیکھا جواب بھی اس طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔ حمید کا دل چاہا کہ اپنا سر دیوار سے ٹکرا دے۔ اس نے کبھی فریدی کی آنکھوں میں مایوسی کی دھندلاہٹ نہیں دیکھی تھی۔ وہ سر ہی نہیں اٹھا رہا تھا۔ کسی سے نظر نہیں ملتا رہا تھا۔ ایک عورت کے ہاتھوں اس کی خودی بچھڑ ہوئی تھی۔ حمید کا دل رو پڑا..... اس نے سوچا کہ نانوتہ تک تو رسائی ناممکن ہے کیوں نہ کرنل وارڈ ہی پر ٹوٹ پڑے۔ لیکن اس کا انجام کیا ہوتا۔

”مگر نانوتہ.....!“ حمید نے کچھ دیر بعد بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم نے کرنل کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں کیوں ڈال رکھی ہیں۔ میں نے اتنے دنوں میں تمہارا کیا بگاڑ لیا جو یہ آزار دہ کر بگاڑ لیں گے۔“

”تم ایک آسیب کو یہ مشورہ دے رہے ہو کہ وہ قابو میں آئے ہوئے دوسرے آسیب کو آزاد کر دے..... نہیں کیپٹن حمید میں اتنی احمق نہیں ہوں۔ مجھے ایسا مشورہ نہ دو۔“

”کیا تم بینک تک جانے کی ہمت کر سکو گے۔ جب کہ فریدی کے شکاری کتے تمہاری تلاش میں تھے۔“

”اوہ..... میں اتنا بیوقوف نہیں ہوں مادام.....!“ کرل وارڈ مسکرایا۔ ”میرے حسابات میرے نام سے نہیں ہیں..... بلکہ ایک مقامی سرمایہ دار کے نام سے ہیں اور اسے میرے اور اس کے علاوہ کوئی تیسرا نہیں جانتا۔“

”خیر تو تم اُسے سونے میں تبدیل کرو گے۔“

”ہاں مادام.....!“

”لیکن تمہیں یہ سن کر افسوس ہوگا کہ زیرو لینڈ میں سونے کو سب سے گھٹیا دھات سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس سے تو چھریاں اور چاقو بھی نہیں بنائے جاسکتے۔ البتہ اگر تم اپنی رومات کواری ڈیم۔ ریڈیم۔ یا پورے نیم میں تبدیل کر سکو تو یقیناً امیر آدمی سمجھے جاؤ گے۔ ان دھاتوں کے عیوض تم وہاں زندگیاں تک خرید سکو گے۔“

”یعنی تو پھر..... وہ اتنی بڑی رقم ہمیں رہ جائے گی۔“

”خاموش رہو! میرے پاس کچھ اس سننے کے لئے وقت نہیں ہے۔ کیپٹن حمید تم اپنی خواب گاہ میں جاسکتے ہو۔“ حمید چپ چاپ ”حرم سرا“ سے نکل آیا۔

اُسے اس کا غم نہیں تھا کہ خود اس کا کیا انجام ہوگا۔ وہ تو صرف فریدی کے متعلق سوچ رہا تھا کیونکہ اس نے اُسے آج تک اتنا مضلل اور صورتاً اتنا شکست خوردہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔



دوسری صبح کسی تیز قسم کی آواز ہی نے نہ صرف حمید بلکہ قاسم کو بھی جگایا تھا۔ آج منڈولین کے نعشوں نے خوابیدہ سماعت کو نہیں گدگدایا تھا بلکہ وہ کوئی ایسی آواز تھی کہ بیداری کے بعد دل کی بڑھتی ہوئی دھڑکن پر قابو پانا محال معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اور قاسم اپنی اپنی مسبریوں سے سر نکالے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔

دفعاً انہوں نے کرل وارڈ کی آواز سنی جو کہہ رہا تھا۔ ”کیپٹن حمید۔ موٹے سمیت تین منٹ کے اندر اندر حرم سرا میں پہنچ جاؤ ورنہ چوتھا منٹ تمہارے لئے موت کا پیغام ہوگا! وہ دونوں بن مکملوں سے کود پڑے!“

”تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے۔“ حمید نے دانت پیس کر پوچھا۔

”محض یہ دکھانے کے لئے..... کہ تم نانوتہ کی قوت دیکھ لو۔“

”ختم کرو نانوتہ.....!“ حمید ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”ہم چوہوں والی جنگ کا تجربہ نہیں رکھتے ہمیں زیرو لینڈ ضرور لے چلو..... میں کرل کی طرف سے بھی تمہارا مشکور ہوں گا مگر خدا ارادے موٹے کا بھی خیال رکھنا۔ اُسے تم سے عشق ہو گیا ہے۔“

”خاموش رہو بد تمیز.....!“ کرل وارڈ گھونسا دیکھا کر بولا۔ ”اگر تم پر مادام کی نظر عیناً ہوتی تو میں ابھی تمہارے جڑے توڑ دیتا۔“

”آؤ.....!“ حمید ہاتھ ہلا کر بولا۔ ”مادام کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“ کرل وارڈ نے مڑ کر ناز کی طرف دیکھا۔

”نہیں.....!“ نانوتہ کا لہجہ سخت تھا۔ ”میں ان لوگوں کو یہاں سے صحیح و سالم لے جانا چاہتی ہوں۔“

”خیر مادام.....!“ کرل وارڈ نے کہا۔ ”اب مجھے اجازت دیجئے کرل فریدی پکڑا جا چکا ہے

میں باہر جا کر اپنا کام دیکھوں۔“

”نہیں..... اب تم بھی براہ راست ہمیں سے زیرو لینڈ ہی جاؤ گے۔ پرسوں تمہارے

گرازیہاں پہنچ جائیں گے۔“

”میں..... زیرو لینڈ.....“ کرل وارڈ ہٹکایا۔

”کیوں؟ کیا کبھی تمہارے دل میں خواہش نہیں پیدا ہوئی کہ جس ملک کے لئے تم کام کر

رہے ہو اُسے دیکھو بھی۔“

”ہوئی ہے..... ہوئی ہے.....!“ وہ جلدی سے سر ہلا کر بولا۔ ”مگر مادام اگر میں یہاں نہ ہوں

گا تو اوپر والوں کو کنٹرول کون کرے گا۔“

”تم اس کی پروا نہ کرو کرل وارڈ..... کوئی دوسرا تمہاری جگہ لے گا۔“

”مم..... مگر.....!“

”صاف صاف کہو کہ تم زیرو لینڈ نہیں جانا چاہتے۔“ نانوتہ کو غصہ آگیا۔

”یہ بات نہیں مادام..... یہ بات نہیں مادام.....!“ وہ دونوں ہاتھ ہلاتا ہوا خوفزدہ آواز میں

”مم..... میں تو اتنی مہلت مانگ رہا تھا کہ اپنے بینک بیلنس کو سونے کی شکل میں تبدیل کر لوں۔“

”اب قیا چکر ہے! حمید بھائی!...“ قاسم نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”مطمئن رہو!... اب کوئی لباس فرور پیش ہو گا۔ میں نے رات ہی تمہیں سب کچھ بتا دیا تو
”خدا کرے حیدر لنگ کو بھی ساتھ لے چلیں۔ ابے میں تو خوشی سے جلوں کا سالے حمید بھائی
”چلو!...“ حمید غریبا۔

وہ دونوں حرم سر امیں آئے لیکن یہاں کا منظر دیکھ کر ان کے دل بلیوں اچھلنے لگے۔ ہاں
کے دس خاص آدمی جوان تہہ خانوں میں رہتے تھے اور جنہیں وہ براہ راست زیر ولینڈ سے
تھی بندھے پڑے تھے۔ اس کی کنیریں بھی اسی حال میں مبتلا نظر آئیں ان کے ہاتھ پشت پر بند
ہوئے تھے اور وہ فرش پر دوڑاؤ بیٹھی ہوئی تھیں۔ کرئل وارڈ کے ہاتھوں میں نامی گن تھی۔

”چلو!...“ وہ نامی گن کو جنش دے کر غریبا۔ ”تم دونوں بھی عورتوں کے پاس اسی طرح
بیٹھ جاؤ۔ جلدی کرو۔“

”کیوں!...“ حمید آنکھیں نکال کر بولا۔

”چلو!... ورنہ ٹریگرب جائے گا!... کل تم نے اس سور کی بچی کے سامنے میرا گڑا لایا
دیکھا تھا۔ آج مرنے سے پہلے اس کی ذلت بھی دیکھ لو!...“

”کیا تم نے اپنی توہین کا بدلہ لے لیا۔“ حمید خوش ہو کر بولا۔

”ہاں!... چلو بیٹھ جاؤ!...“

”اب تو میں ضرور بیٹھوں گا۔ پیارے کرئل وارڈ! تم واقعی شاندار ہو پروانہ کرو۔ تمہیں
لینے کا ذمہ میں لیتا ہوں۔“

”خاموش رہو حقیر کیڑے تم تینوں بھی سورج کی روشنی نہ دیکھ سکو گے۔ میں اتنا گدھا نہیں
ہوں کہ تمہیں چھوڑ دوں!... اس تہہ خانے سے صرف پانچ آدمی باہر جائیں گے میں اور میرے
چار خاص آدمی ہیں۔“

اتنے میں زنجیروں کی جھکار سنائی دی اور کرئل فریدی بیڑیاں پہنے ہوئے کسی زخمی شیر
طرح جھومتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے نانوتہ تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے
اور وہ اپنا نچلا ہونٹ چپا رہی تھی۔ نانوتہ کے بعد کوئی عورت آئی اس کے بھی ہاتھ پشت پر بندھے
ہوئے تھے اور وہ بڑی طرح چیخ رہی تھی۔

”ارے!... یہ بیڑیاں کھولو!... ارے میرے چہرے پر آگ لگی ہوئی ہے!... بیڑیاں

کھولو!... ارے میں مری!... یہ کون ہے کس نے اس کی ہمت کی ہے!...“

ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ گھنٹوں سے چیختی رہی ہو!... کیونکہ اس کا گلارہ ہوا تھا اور آواز
نہیں پہچانی جاسکتی تھی۔ شکل اس لئے نہیں پہچانی جاسکتی تھی کہ اس کا سارا چہرہ بیڑیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔
”خاموش رہو!...“ کرئل وارڈ ہاڑا۔ ”میرے ہاتھ میں نامی گن ہے! اگر اب ایک لفظ بھی

تمہاری زبان سے نکلا تو ایک درجن گولیاں تمہارے جسم میں اتر جائیں گی۔“
عورت خاموش ہو گئی۔ لیکن اس کے جسم کی لرزشیں بتا رہی تھیں کہ وہ کسی بہت بڑی
اذیت میں مبتلا ہے۔

نانوتہ کھڑی خونخوار نظروں سے کرئل وارڈ کو گھور رہی تھی۔ دفعتاً اس نے کہا۔ ”غدار نمک
حرام!... تجھے اس کی سزا ضرور ملے گی۔“

”یہ کون عورت بول رہی ہے۔ یہ کون ہے۔“ وہ عورت چیختی جس کے چہرے پر بیڑیاں پڑ چکی
ہوئی تھیں۔

”خاموش!...“ کرئل وارڈ چیخا اور ساتھ ہی دس بارہ گولیاں نامی گن سے نکلیں۔ مگر نشانہ
وہ عورت نہیں تھی۔ درہچے کے دبیز پردے میں البتہ کئی سوراخ ہو گئے تھے۔

عورت خاموش ہو گئی۔ شاید وہ سہم گئی تھی۔

”تم! کرئل وارڈ نے نانوتہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اب لے جاؤ مجھے
زیر ولینڈ! یہ دولت میں نے اسی لئے پیدا کی تھی کہ اس سے دست بردار ہو جاؤں۔ کیوں؟ جس

دولت کے حصول کے لئے میں نے اپنے ملک سے غدار کی تھی اُسے چھوڑ کر زیر ولینڈ میں
جاؤں جہاں گدھے بستے ہیں۔ جہاں سونے کی کوئی وقعت اس لئے نہیں ہے کہ اس سے چاؤ اور
چہرے بھی نہیں بنائے جاسکتے!... ہا ہا ہا!... تم پاگل ہو گئی ہو!... نانوتہ!... سونا اور وقعت!...
ہا ہا ہا!... سونے کے لئے نیند حرام ہو جاتی ہے۔ نانوتہ مگر یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی!...
تم پاگل ہو گئی ہو نانوتہ!... اس لئے تمہیں مر جانا چاہئے۔“

نانوتہ بڑا سامنے بنا کر بولی۔ ”مار ڈال مجھے۔ میں موت سے نہیں ڈرتی۔ لیکن تیرا انجام بھی بڑا
ردناک ہو گا!... غدار کتے۔“

اچانک وہ عورت پھر چیخی جس کے چہرے پر پٹیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ ”یہ کون نانوتہ ہے.... یہ کیا فراڈ ہے.... نانوتہ تو میں ہوں.... میں نانوتہ ہوں.... یہ کوئی مکار عورت ہے.... کرنل وارڈ.... میرے چہرے کی پٹیاں کھولو.... میں گمنامی میں نہیں مرنا چاہتی.... کوئی عورت تجھے دھوکا دے رہی ہے۔“

”خاموش رہو رو میلا تو بیمار ہے۔ اس لئے مجھے تجھ پر رحم آتا ہے۔“ کرنل وارڈ نے کہا۔
تو یہ رو میلا ہے حمید نے سوچا۔ مگر اس کے چہرے پر پٹیاں کیسی چڑھی ہوئی ہیں.... رو میلا نانوتہ کی مخصوص خاموشی تھی۔

”میں رو میلا نہیں نانوتہ ہوں.... پٹیاں کھولو.... ارے کیا رو میلا نے کوئی فراڈ کیا ہے.... او حرافہ تو میری آواز کی نقل اتار سکتی ہے.... مجھے علم نہیں تھا.... وارڈ پٹیاں کھول دے ذلیل.... ارے میرا چہرہ بھنا جا رہا ہے۔“

”پٹیاں کھول دو۔“ کرنل وارڈ نے اپنے ایک آدمی سے کہا۔
حمید نے فریدی کی طرف دیکھا جو متحیرانہ انداز میں ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس نے حمید سے ایک بار بھی نظر نہیں ملائی۔

ایک بیک ساری عورتیں چیخ پڑیں اور حمید بوکھلا کر مڑا اور پھر اس کے حلق سے بھی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ کتنا بھیانک تھا اس عورت کا چہرہ.... ساری پٹیاں کھول دی گئی تھیں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے چہرے کو تیزاب میں غوطہ دے دیا گیا ہو۔

”تم نانوتہ ہو....!“ کرنل وارڈ نے مضحکہ اڑانے والے لہجے میں پوچھا۔
”ہاں.... میں نانوتہ ہوں.... اس کتیا نے میرا بھینس بدلا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہے اس کے دل میں۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتی.... اپنی نامی گن میرے سینے میں خالی کر دے۔ مگر میں نانوتہ ہوں.... ارے کیا تو خود نہیں دیکھتا اندھا ہو گیا ہے۔“

کرنل وارڈ نے قہقہہ لگایا اور اپنے ایک آدمی سے بولا۔ ”نانوتہ کی خواب گاہ سے آئینہ لاؤ۔“
وہ چلا گیا۔

”کیوں....“ وہ چیخی۔ ”تو نے کیا کیا ہے ظالم.... ارے بتا تا کیوں نہیں۔ میرے چہرے میں آگ کیوں لگی ہوئی ہے۔“

”میں کیا جانوں۔“ کرنل وارڈ نے لاپرواہی سے کہا۔ ”لیکن تم نانوتہ ہر گز نہیں ہو یہاں کسی سے پوچھ لو۔“ اتنے میں آئینہ بھی آگیا۔ لیکن جیسے وہ اس کے سامنے لایا گیا اس کے حلق سے ایک کربہ سی چیخ نکلی۔ اگر کرنل وارڈ کے ایک آدمی نے اُسے سنبھال نہ لیا ہوتا تو زمین پر چاروں خانے چت گری ہوتی۔

پھر وہ اس کے بازوؤں میں پڑی ہوئی چیختی رہی۔ ”ظالم.... تو نے تیزاب ڈال کر میرا چہرہ بگاڑ دیا۔ میرا چہرہ بگاڑ دیا کیونہ کتے۔“

چیختے چیختے اچانک وہ کسی ننھی سی بچی کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
”ہاں....!“ کرنل وارڈ نے قہقہہ لگایا۔ ”یہ وہ رو رہی ہے جو کل تک لاف دگراف کرتی رہی تھی۔“
”اے بچو۔“ سارے آلو کے ٹھٹھے۔ ”دفعۃً قاسم دہاڑا اور جھومتا ہوا اٹھا شائد اس کی ذہنی رو بہک گئی تھی۔ اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”سالے تم نے اتنی چھوٹی عورت کا چہرہ بگاڑ دیا اے میں تجھے یہیں ختم کر دوں گا۔“

”قاسم.... قاسم....!“ حمید اس کا ہاتھ پکڑتا ہوا بولا۔
”ٹھیکے پر گئے قاسم واسم.... ہاتھ چھوڑو میرا۔“ قاسم اُس کا ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھتا ہی چاہتا تھا کہ نامی گن کی دس پانچ گولیاں اس کے شانے پر سے گزر گئیں۔
”ارے باپ رے!“ وہ دھپ سے زمین پر بیٹھ گیا اور ذہنی رو پھر اپنے صحیح راستے پر آگئی۔
کرنل وارڈ پھر اس عورت کی طرف مڑ گیا وہ اب بھی اسی طرح بلک بلک کر روئے جا رہی تھی....
دفعۃً کرنل وارڈ نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ”اس کے چہرے پر اور تیزاب ڈالو.... ابھی اسے اندھ سی بھی تو ہوتا ہے۔“

”نانوتہ.... ہاں تم نانوتہ ہی ہو۔ دیکھ لیا تم نے کرنل وارڈ کا انتقام.... یہ نانوتہ ہے۔ ہا ہا ہا.... اور تیزاب لاؤ.... جلدی کرو۔“

ایک آدمی پھر دوڑا گیا لیکن اس نے واپسی میں دیر نہیں لگائی اس کے ہاتھ میں بوتل تھی اور دوسرے میں روٹی۔

”نہیں نہیں! مجھے اندھ سی نہ بنا بلکہ مار ڈال.... میں تجھ سے استعا کرتی ہوں۔ کرنل وارڈ مجھے مار ڈال۔“

”میں شاید پاگل ہو جاؤں گی۔“ نانوتہ آہستہ سے بڑبڑائی۔ پھر یک بیک چوک کر بولی۔ ”تم نے میرا چہرہ کیوں بگاڑ دیا۔ میں تمہیں اتنا درندہ نہیں سمجھتی تھی۔ یہ بتاؤ کیا میں تم لوگوں کو قتل نہیں کر سکتی تھی۔ تم ہزار بار میری زد پر آئے تھے۔“

”یہ اسی کا جواب ہے نانوتہ۔۔۔۔!“ فریدی نے مسکرا کر نرم لہجے میں کہا۔

”یہ اس کا جواب ہے کہ تم نے میرا چہرہ بگاڑ دیا۔“ وہ چیخ کر بولی۔

”مجھے افسوس ہے کہ تم اندھ سی نہیں ہو سکیں۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”مگر نہیں تم پھر آئینہ دیکھو کہ اندھ سی ہو یا نہیں۔“

جیسے ہی آئینہ اس کے سامنے لایا گیا ایک بار پھر اس کے حلق سے چیخ نکلی۔ آنکھیں پھیل گئیں اور منہ حیرت سے کھل گیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے سکتے ہو گیا ہو۔ پھر یک بیک اس نے ہنسنا شروع کر دیا۔ دیوانوں کی طرح ہنسی رہی۔ ہسٹریائی انداز میں قہقہے لگاتی رہی۔

”ختم کرو۔“ فریدی اس کا شانہ دباتا ہوا بولا اور وہ چوک کر خاموش ہو گئی۔ چند لمحوں فریدی کی طرف دیکھتی رہی پھر مضطرب آواز میں بولی۔ ”یہ سب کیا تھا۔“

”کل شام والی لاف و گزاف کا جواب۔“ فریدی مسکرایا۔ ”تمہیں اس پر ناز ہے کہ سارا یورپ تمہارے نام سے تھراتا ہے۔ تمہارے اور تھریسیا کے نام پر یورپ کے ملکوں میں زلزلہ آجاتا ہے۔ لیکن میں اگر چاہوں تو تمہیں رلا دوں تم مضمی مضمی بچیوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتی رہو اور اسی وقت چاہوں تو تمہیں رلا دوں تمہیں رلا دوں۔۔۔۔۔ کہو تو اب تمہیں کچھ دیر کے لئے پاگل ہی بنا دوں اور تم دوڑ دوڑ کر لوگوں کو کاٹتی بھنبھورتی پھرو۔ وہ حصار کہاں گیا جو تم نے پچھلی رات اپنی مسہری کے گرد قائم کیا تھا۔ وہ ڈیڑھ ہزار آدمی کہاں گئے جن سے تم کام لیتی تھیں۔ میں نے انہیں باہر نکال دیا تھا۔ تم تو اس وقت بیہوش پڑی تھیں اور دیکھو میں نے یہ سب کچھ خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر کیا ہے۔ تمہاری گردن پر تو ہمارے تین فوجیوں اور خود اپنے ایک آدمی کا خون ہے میں اس وقت بھی چاہوں تو تمہارا گلا گھونٹ کر تمہیں ختم کر سکتا ہوں۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔ خاموش کیوں ہو۔“

”وہ کون ہے۔۔۔۔۔ اور یہ۔۔۔۔۔!“ اس نے نقلی فریدی اور نقلی نانوتہ کی طرف ہاتھ اٹھا کر پوچھا۔

”گرادو زمین پر“ کرئل وارڈ گر جا۔“ اس کا چہرہ اور بھیانک بناؤ۔۔۔۔۔ اسے اندھ سی بھی ہونا چاہئے۔“ اُسے زمین پر گرا کر بے بس کر دیا گیا۔ لیکن وہ اب بھی چیخ رہی تھی رو رہی تھی آنکھیں بھنبھنتی تھیں اس کے چہرے پر مزید تیزاب لگایا جانے لگا۔ تیزاب ڈال کر اُسے زوئی سے چاروں طرف پھیلا یا جا رہا تھا۔

”حمید بھائی۔۔۔۔۔ یہ ظلم ہے۔“ قاسم آہستہ سے بولا۔

”خاموش بیٹھو بیٹا۔۔۔۔۔ مجھے مانس گزر رہا ہے۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔!“

”اے۔۔۔۔۔ چوپ۔۔۔۔۔!“ حمید نے اسی کے لہجے میں کہا۔

اتنے میں کرئل وارڈ نے اپنے ایک آدمی کو ٹائی گن دیتے ہوئے کہا۔ ”انہیں کور کئے رکھو۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔ پھر وہ باہر چلا گیا۔“

حمید اس عورت کو صاف دیکھ سکتا تھا جس کے چہرے پر مزید تیزاب لگایا جا رہا تھا۔ مگر یہ کیا؟ وہ اچھل پڑا۔۔۔۔۔ اور بچوں کے بل اوپر اٹھ کر دیکھنے لگا۔ وہ برابر چیخے جا رہی تھی اس کی آنکھیں پھینچی ہوئی تھیں۔ مگر چہرہ تو صاف ہوتا جا رہا تھا۔ سرخ و سفید جلد ظاہر ہوتی جا رہی تھی۔ ذرا ہی سی دیر میں چہرہ صاف ہو گیا۔ یہ سو فیصدی نانوتہ ہی تھی۔ اس کی رنگت تو اب پہلے سے بھی زیادہ نکھر آئی تھی۔ مگر وہ چیختی ہی رہی تھی اور پہلے ہی کی طرح زمین پر چیر پھینچی رہی آنکھیں اب بھی پھینچی ہوئی تھیں۔

”اے۔۔۔۔۔ حمید بھائی۔“ قاسم بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”یہ کیا دو دو نانوتہ۔۔۔۔۔ ارے باپ رے بھوت۔“ وہ حلق پھاڑ کر چیخا تھا۔

نانوتہ کھڑی کر دی گئی تھی اور اس سے آنکھیں کھولنے کو کہا جا رہا تھا۔

دفعتاً قاسم نے پھر بھوت کا نعرہ لگایا کیونکہ ایک کرئل فریدی تو پا بجولاں کھڑا ہوا تھا اور دوسرا در پیچے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس بار تو سبھی چیخے تھے اور نانوتہ نے بوکھلا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ کرئل فریدی اس کے قریب کھڑا مسکرا رہا تھا۔ لیکن اس کے جسم پر وہی لباس تھا جو کرئل وارڈ پہنے ہوئے تھا۔ حمید بھی اٹھ کر آہستہ آہستہ ان کے قریب آ گیا۔

”نانوتہ۔۔۔۔۔ اب کیا خیال ہے۔۔۔۔۔ تم کتنی عظیم ہو۔“ حمید نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”دونوں میرے ماتحت ہیں۔“

”میک اپ کرنے میں تمہیں کمال حاصل ہے۔ میرے چہرے کی مٹی کیسے پلید کی تھی۔“

”وہ بھی میک اپ ہی تھا۔ ایک ایسا سیال تمہارے چہرے پر لگایا تھا کہ جلن ہوتی رہے۔“

”اور تم نے یہ نفسیاتی طریقے اختیار کر کے مجھے رلایا بھی اور ہنسایا بھی۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”واقعی تم عظیم ہو تمہارے آگے سر جھکاتی ہوں مگر تم سے رحم کی بھیک نہیں مانگوں گی۔“

”مانگو بھی تو یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ مجھے تو تمہیں قانون ہی کے حوالے کرنا پڑے گا۔ وہ اس پر کچھ بھی نہ بولی۔ بلکہ اس کے انداز سے تو یہ ظاہر ہو رہا تھا جیسے اپنی گرفتاری پر ذرہ برابر بھی تردد نہ ہو!... چند لمحوں ٹھہرا کر اس نے پوچھا۔ ”کیا سچ کرنا کرنا اور ڈرنے غداری کی ہے۔“

”اس غریب نے اس غار کی شکل ہی کہاں دیکھی ہے۔ میں نے تو اس رات تم لوگوں کو ڈونج دیا تھا۔ میرا یہی ماتحت میرے میک اپ میں ٹیکم گڈھ چلا گیا اور میں یہاں کرنا کرنا اور ڈونج دیا تھا۔ پھر وہ مجھے مل ہی گیا۔ لیکن تمہ خاوں کا راستہ اس گدھے کو بھی نہیں معلوم تھا وہ اس وقت سے اب تک میری قید میں ہے لیکن اس سے میں نے یہ ضرور معلوم کر لیا تھا کہ زیبا بھی اس کی کار پر داز ہے اور اس کا کام ہے نوجوانوں کو پھانس کر اس کے پاس لانا۔ تم سے اس رات یہ حماقت ہوئی کہ تم نے زیبا کو قاسم کے لئے پیغام بھیجا کہ وہ اسے خیمے کی پشت پر لائے۔ تم سے یہ حماقت محض اس لئے سرزد ہوئی تھی کہ تمہیں میرے یہاں سے چلے جانے کی اطلاع مل چکی تھی۔ چونکہ اس دن راکٹ اور جہاز کا معرکہ ہو چکا تھا اس لئے بھی تم مطمئن تھیں کہ کوئی اُدھر آنے کی ہمت نہ کر سکے گا۔ بہر حال زیبا پر میں نے گہری نظر رکھی تھی۔ اُدھر وہ اُسے بتائے ہوئے مقام پر چھوڑ گئی اور اُدھر میں الرٹ ہو گیا۔ وہاں سے تمہارا خاص آدمی اُسے اس غار کے دہانے پر لے گیا تھا جس سے تمہ خاوں کا راستہ شروع ہوتا ہے۔ میں نے راستہ پیدا کرنے کا طریقہ دیکھ لیا تھا اور یہ سب کچھ تمہارے آدمیوں کی غفلت کا نتیجہ تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ مجھے تمہا ہی اندر جانا چاہئے۔ کیوں خواہ مخواہ دوسری جا میں ضائع کراؤں۔ بس پھر یہی تدبیر سمجھ میں آئی کہ کرنا کرنا اور ڈونج کا سہارا لیا جائے دیے یہ تو مجھے معلوم ہی تھا کہ تمہ خاوں تک اس کی رسائی نہیں ہوئی یہاں آیا تو تم نے اس پر غصے اور حیرت کا اظہار کیا اس سے پہلے تمہارے پہرے دار گولی تک مار دینے پر تیار تھے۔ لیکن میں نے تمہاری دہائی دے کر انہیں اپنا نام بتایا تھا اور کہا تھا کہ

تم نے ٹرانسمیٹر کے ذریعہ مجھے تمہ خاوں میں طلب کیا ہے۔ تب وہ مجھے کھینچتے ہوئے یہاں لا۔ تمہ میں نے یہاں رہ کر اچھی طرح سے جائزہ لیا۔ تمہارے یہی دس آدمی مزاحمت کر سکتے تھے وہ ڈیڑھ ہزار مزدور تو موم کی ناک تھے، جو یہاں کی قید سے بڑی طرح اکتا گئے تھے۔ پچھلی ہی رات میں نے انہیں یہاں سے نکالا تھا اور باہر سے اپنے پانچ آدمی بلائے تھے۔ یہ لڑکی جسے تم نانوتہ کی شکل میں دیکھ رہی ہو اور یہ چاروں مگر اب اتنا تو بتا ہی دو کہ تم نے ان تین خالی کنوؤں سے کیا نکالا ہے۔ غالباً یہی کام تم یہاں کر رہی تھیں اور اب اس کا اختتام ہو چکا ہے۔“

”قطعی طور پر اختتام....!“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”اب اس علاقے میں ایک بوند بھی نہیں ملے گی۔ وہ ایک نایاب ترین ایندھن ہے کرنا فریدی جسے ہم لمبی پرواز میں استعمال کریں گے یہ بھی زیر ولینڈ ہی کی دریافت ہے۔ یہ پیٹرولیم سے کئی ہزار گنا ہلکا اور سریع الاثر ہوتا ہے۔ لمبی پرواز سے کہیں تم یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ ہم اسے بین براعظمی راکٹوں میں استعمال کریں گے۔ نہیں.... یہ سیاروں کے سفر کے لئے بہت موزوں ہوگا۔ ہم بہت جلد چاند میں اپنا پرچم نصب کریں گے۔“

”میرے بکرے کو بھی ساتھ لیتی جانا۔“ حمید نے کہا۔ ”تاکہ وہ واپسی پر چاند کا سفر نامہ باتصویر مع پرائیویٹ حالات کھول کھول کر لکھ سکے۔“

نانوتہ ہنس کر پھر کرنا کی طرف متوجہ ہو گئی اور کرنا نے کہا۔ ”تو وہ تمہارا راکٹ ایندھن ہی لے کر اڑا کرتا ہے۔“

”ہاں.... اب وہ واپس نہیں آئے گا کیونکہ آخری کھیپ جا چکی ہے۔“

”مگر اس کی واپسی کبھی کسی نے نہیں دیکھی۔“

”واپسی اُدھر سے نہیں ہوتی۔ واپسی پر وہ یہاں سے دس میل کے فاصلے پر ایک سرنگ میں داخل ہو کر ایندھن کے کنوؤں تک پہنچتا تھا.... واپسی پر اس سے جو گیس خارج ہوتی ہے دیکھی نہیں جاسکتی۔ رواں گی کے وقت ایک مجبوری کی بناء پر وہ گیس نظر آنے لگتی تھی۔ ورنہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ دراصل اُسے باہر نکلنے کے لئے راستہ بنانا پڑتا تھا۔ اس لئے اس کے آگے اور پیچھے ایک ایسا آلہ لگایا گیا تھا جس سے حرارت پیدا ہو کر پتھر کو پگھلا دے وہ باہر نکل کر اتنی دیر تک فضا میں معلق رہتا تھا جب تک کہ نچلے آلے سے خارج ہونے والی حرارت اس خلاء کو پُر نہیں کر دیتی تھی۔ اس پاس کے پتھر پگھل کر اسی خلاء میں سما جاتے تھے تم لوگ جس حرارت سے

ہوتا ہے گیس کی باریک سی لکیر نکل کر وہی شکل اختیار کر لیتی ہے جس کے لئے تم ہاتھ کو حرکت دو۔
 ”وہ میری طرف سے تحفے کے طور پر رکھو۔“ نانوتہ مسکرائی۔ ”میں تمہیں کبھی نہیں بھلا
 سکتی عرصہ سے خواہش تھی کہ تمہیں قریب سے دیکھوں۔ بہت شاندار ہو کر تل..... عظیم.....
 لیکن اسے لکھ لو کہ میں ہی ایک نہ ایک دن تمہیں زیر و لینڈ لے جاؤں گی۔“

”جیلانی کہاں ہے.....!“ حمید نے پوچھا۔ ”میں نے کئی دنوں سے اُسے دیکھا نہیں۔“
 ”بیٹھو! تم سب بیٹھ جاؤ۔ میں تھکن محسوس کر رہی ہوں۔ کچھ دیر اور تمہیں دیکھنا چاہتی
 ہوں کر تل میری یہ خواہش بھی پوری کر دو۔“

”کوئی چال.....!“ حمید مسکرایا۔

”میں نانوتہ ہوں.....“ وہ غصیلی آواز میں بولی۔ ”کر تل کے سامنے سر جھکا چکی ہوں لہذا
 اس کی موجودگی میں میرا سر نیچا ہی رہے گا۔ ذرا یہ صرف دس منٹ کے لئے یہاں سے ہٹ کر
 دیکھیں کیا ہوتا ہے۔“

”میں نے پوچھا جیلانی کہاں ہے۔“ حمید نے اُسے پھر ٹوکا۔

”جیلانی کو دارالحکومت واپس بھجوا دیا۔ اس کی ذہنی حالت خراب ہو رہی تھی۔ اُسے تو میں
 نے صرف اس لئے دیکھنا چاہا تھا کہ شاید میں اُسے پہچان سکوں۔ لیکن میں نہیں جانتی کہ وہ کون
 ہے۔ میں نے اُسے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس نے مجھے
 کہاں دیکھا تھا۔ لیکن وہ بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکا تھا۔ اس تصویر کا مسئلہ میرے لئے
 ہمیشہ الجھن کا باعث بنا رہا ہے گا۔“

”تم دھوئیں کے جھسے کی شکل میں درشن دیتی تھیں۔ وہ کیا بلا تھی۔“ حمید نے پوچھا۔

”ہمارا ٹیلی ویژن جو ابھی تجرباتی دور میں ہے اس کے لئے کسی ریسرچنگ سیٹ کی ضرورت
 نہیں ہم جہاں چاہیں مناظر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے صرف ایک
 ہی سال میں ہم اس قابل ہو جائیں کہ تم میرا مجسمہ اپنے گھر میں دیکھ سکو۔“

”میرے گھر میں بھی..... جڑور..... جڑور..... اچھا۔“ قاسم جلدی سے بولا۔ کچھ دیر بعد وہ
 اٹھ گئے۔ پورا قافلہ اس تنگ سے درے سے گزرنے لگا جس کا اختتام اس پتھر لے میدان میں
 ہوا۔ جہاں ایک رات فریدی اور اس کے ساتھیوں نے جہنم کی آج محسوس کی تھی۔ اس درے

پریشان ہو کر میلوں دوڑتے چلے گئے تھے وہی پتھر کو پگھلا دینے والی حرارت تھی۔ نچلے حصے میں
 حرارت کا آلہ اُس نلکے سے ملحق ہوتا ہے جس سے گیس خارج ہوتی ہے۔ نتیجے کے طور پر وہ نلکا
 بھی گرم ہو جاتا ہے اور اسی حرارت کی وجہ سے اُس سے خارج ہونے والی گیس چمکیلا پن اختیار
 کر لیتی ہے، جب تک یہ نلکا گرم رہتا ہے یہی کیفیت برقرار رہتی ہے جہاں ٹھنڈا ہوا گیس کی چمک
 غائب ہو گئی..... بہر حال یہ ایک مجبوری ہی تھی جس کی بناء پر لوگ اس کے وجود سے واقف
 ہو سکے ورنہ تم تک بات ہی نہ پہنچتی۔ خیر اگر پہنچتی بھی تو میرا دعویٰ ہے کہ تم بھٹکتے ہی رہ جاتے۔
 ستم تو جیلانی کی تصویر ہو گئی تھی وہ تصویر نمائش میں رکھی گئی اور مجھ سے حماقتیں سرزد ہونے
 لگیں، نہ کر تل وارڈ اس میں بہت زیادہ دلچسپی لیتا اور نہ تم اس کے پیچھے لگتے۔ اوہ..... اب تم یہ بتاؤ
 کہ تم نے میرا حصار کیسے توڑا تھا۔“

”پانی سے.....!“ فریدی مسکرایا۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا..... تم کیا جانو.....!“ نانوتہ بوکھلا کر بولی۔

”مشاہدہ.....! جب بھی تم حصار میں نظر آتی ہو میں نے تمہارے شانے سے ایک کیمرا لٹکا
 دیکھا ہے اور ہاتھ میں یا حصار کے اندر ہی کہیں شراب کی بوتل بھی دیکھی ہے لیکن کیا اس میں
 شراب ہوتی تھی.....؟ پھر جب خواب گاہ کی مسہری کے گرد حصار نظر آیا تو وہاں بھی پانی موجود تھا
 اور بڑے اہتمام کے ساتھ حصار کے اندر ہی رکھا گیا تھا۔ پچھلی رات میں نے کافی غور و فکر کے
 بعد تھوڑا سا پانی حصار کی طرف ڈھلکایا تھا۔ تم بے خبر سو رہی تھیں۔“

”ہائے یہ سوتے میں کیسی لگتی ہو گی حمید بھائی۔“ قاسم آہستہ سے بڑبڑایا۔

”چپ رہو.....!“ حمید اُسے جھڑک کر ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ فریدی کہہ رہا تھا۔ ”ہاں
 تو میں نے پانی ڈھلکایا مقدار کم ہی تھی۔ بہر حال تجربہ تسلی بخش ثابت ہوا جتنی جگہ سے پانی کی
 لکیر گزری تھی اتنی جگہ میں حصار کی چمکدار لکیر کٹ گئی، اتنی کئی ہوئی جگہ میں نے تسلی سی
 چھڑی ڈال دی! جو پڑی رہی..... بس اس کے بعد ہی دو گیلن پانی نے پورے حصار کا صفایا کر دیا تھا
 اور تم میرے قبضے میں تھیں۔ تمہیں گہری قسم کی بیہوشی کی دوا دی تھی جس کے زیر اثر تم آج صبح
 تک رہیں۔ یہ بھی معلوم ہو چکا ہے تم وہ حصار بناتی کس طرح ہو! وہ کیمرا بھی اب میرے قبضہ
 میں ہے اس میں وہی گیس بھری ہوئی ہے اور اس کے نوزل سے جو بادی النظر میں نہیں معلوم

میں داخل ہونے سے پہلے وہ ایک ایسے سوراخ سے گزرے تھے جس کا قطر تقریباً پانچ فٹ تھا اور جسے بند کرنے کے لئے ایک بہت بڑی سل میکنزم پر حرکت کرتی تھی۔ زوانگی سے قبل نقلی فریدی اور نقلی نوتہ کو آزاد کر دیا گیا اور اب وہ دونوں ان شکلوں میں بھی نہیں تھے۔ چہرے میر کے لئے بالکل نئے تھے۔ اس لئے وہ اس کے علاوہ اور کیا سمجھ سکتا تھا کہ وہ بلیک فورس ہی کے آدمی ہوں گے۔ نانوتہ کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی وہ سب درے سے باہر آئے نانوتہ نے فریدی سے کہا۔ ”اب تم سب جتنی تیزی سے دوڑ سکتے ہو دوڑو۔۔۔ اگر ہم پندرہ منٹ کے اندر اندر اس سبز نشان تک نہ پہنچے تو ہماری ہڈیوں کا بھی پتہ نہ چلے گا۔“

”کیوں۔۔۔؟“

”میں اپنے ملک سے غداری نہیں کر سکتی۔ جب ہم اس سوراخ سے گزر رہے تھے میں نے اپنے بائیں شانے سے ایک سوئچ آن کر دیا تھا جو سوراخ کے سرے ہی پر لگا ہوا ہے۔ پچیس منٹ بعد خود بخود اس سوئچ بورڈ سے ایک تحریک ہوگی جو خاص خاص مقامات کے ڈائنامائٹس تک پہنچے گی اور وہ سب بیک وقت پھٹ جائیں گے۔ دوڑو میں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں دس گیارہ منٹ گزر چکے ہیں وہ سبز نشان میں نے بنایا تھا تاکہ اس قسم کے مواقع پر سب کچھ تباہ کر دوں اور ہمارے آلات غیروں کے ہاتھ نہ آسکیں۔ وہاں سب کچھ ہے کرئل اور یہ بھی سن لو کہ تم اس سوئچ کو تلاش نہیں کر سکو گے۔ اگر خود کشی کرنا چاہتے ہو تو ضرور واپس جاؤ۔۔۔ نانوتہ نے بے تحاشہ دوڑنا شروع کر دیا۔

پھر سب ہی بھڑک کر بھاگے! مگر فریدی تو بیچارے قاسم کو دیکھ رہا تھا جس کے فرشتے بھی نہیں دوڑ سکتے تھے۔

”ارے۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“ وہ چیختا ہوا دوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دفعتاً فریدی اس کی طرف جھپٹا اور اسے اتنی پھرتی سے اپنی کمر پر لاد لیا کہ خود قاسم نے بھی بوکھلا کر اوٹ پٹانگ بکواس شروع کر دی۔ ”ارے۔۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔۔ واہ۔۔۔۔۔ کیا مذاق ہے۔۔۔۔۔ ارے گردے کون ہو تم۔۔۔۔۔ کون ہو تم۔۔۔۔۔“

قاسم کو کمر پر کوئی دیوبی لاد سکتا تھا۔۔۔۔۔ اور پھر لاد کر دوڑنا۔۔۔۔۔ خدا کی پناہ۔۔۔۔۔ مگر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی چیتا کسی بکرے کو پشت پر لاد کر بھاگا ہو۔

ذرا سی دیر میں فریدی ان دوڑنے والوں کے برابر پہنچ گیا جو اس سے بہت پہلے دوڑے تھے۔ قاسم برابر چیخے جا رہا تھا۔ ”ارے تم کون ہو۔۔۔۔۔ ارے گردوں غا تو ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں گے۔۔۔۔۔ ارے بچاؤ۔۔۔۔۔ بچاؤ۔۔۔۔۔!“

حمید نے دیکھا تو بے تحاشہ ہنس پڑا۔۔۔۔۔ فریدی اب سب سے آگے جا رہا تھا اس کی رفتار میں ابھی تک فرق نہیں آیا تھا۔

کسی نہ کسی طرح وہ سبز نشان تک پہنچ گئے۔ یہ ایک بڑی سی چٹان تھی جسے سبز رنگ دیا گیا تھا۔ ”کرئل تم واقعی آسیب ہو۔“ نانوتہ ہانپتی ہوئی بولی۔ کبھی وہ زمین پر پڑے ہوئے قاسم کو دیکھتی تھی اور کبھی فریدی کی طرف جو بڑے بے تعلقانہ انداز میں کھڑا درے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ نہ تو اس کے نتھنے پھول چپک رہے تھے اور نہ سیدہ ہی لوہار کی دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ نانوتہ آگے بڑھی اور اس کے بائیں شانے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ حمید بڑی تیزی سے اپنی کھوپڑی سہلارہا تھا۔

”ارے باپ رے۔۔۔۔۔“ قاسم بڑبڑایا اور منہ پھیر کر دانت نکال دیئے۔

دفعتاً اسی وقت ایک زوردار گڑگڑاہٹ سنائی دی اور درے کے بعد کا حصہ دھوئیں اور غبار میں چھپ گیا۔ بڑے بڑے پتھر کافی بلندی تک اڑتے چلے گئے تھے۔



تیسرے دن وہ دارالحکومت میں تھے۔ نانوتہ کو جیل بھیج دیا گیا تھا۔ اس کے سارے ساتھی بھی تھے۔ زیبا اور کرئل وارڈ بھی سلاخوں کے پیچھے ہی تھے۔

اخبارات نے نت نئی کہانیاں چھاپی تھیں۔ ہر طرف نانوتہ اور فریدی کے چرچے تھے۔ جیلانی بھی موضوع بحث بنا ہوا تھا۔ لیکن جیلانی تھا کہاں؟

فریدی اور حمید بیگم تنویر کے گھر پہنچے۔ وہ گھر ہی پر موجود ملیں۔

”جیلانی تین دن سے ہسپتال میں بیہوش پڑا ہوا ہے۔ کبھی ذرا سی دیر کے لئے ہوش آتا ہے۔ لیکن کسی کو پہچانتا نہیں۔ اس نے صوفیہ کو بھی نہیں پہچانا۔ چار دن پہلے کی بات ہے کہ صبح کو اچانک بیرونی برآمدے میں پڑا ہوا ملا۔ وہ بیہوش تھا۔ کچھ لوگ اسے ایک رات اس کے کمرے سے اٹھا کر لے گئے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور وہ پاگل لڑکی رو رو کر جان دیئے دیتی ہے۔ تصویر کی

معلق مزید چھان بین کر رہا تھا اور فریدی کہیں اور تھا۔ شام کو جب دونوں ملے تو حمید کے لئے دو حیرت انگیز چیزیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ نانوتہ مرگئی اور اس کی لاش مردہ خانے سے غائب ہو گئی اور دوسری یہ کہ جیلانی برمی اور انگریزی کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں بول سکتا۔ اس نے بیگم تنویر اور صوفیہ کو بھی پہچاننے سے انکار کر دیا ہے۔ اب صوفیہ کو غش پر غش آرہے ہیں اور بیگم تنویر بچاڑیں کھا رہی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ جیلانی کو اپنا بیٹا سمجھتی تھیں..... جیلانی سے جب یہ کہا گیا کہ وہ ایک بہت بڑا مصور ہے تو وہ دیر تک ہنستا رہا کہنے لگا کہ شاید میں ایک سیدھی لکیر بھی نہ کھینچ سکوں آپ مجھے مصور کہتے ہیں اور جب اُسے اس کی بنائی ہوئی تصویر چرواہی دکھائی گئی تو بیساختہ چیخ اٹھا۔ ارے یہ تو نانوتہ ہے..... وہ اکثر فوجیوں کے کیپ میں تنگی ہو کر ناچتی تھی اور پھر وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر بعد بتایا کہ وہ ان دنوں کی بات ہے جب جاپان برما پر بمباری کر رہا تھا۔ جیلانی جواب نام نوا بتاتا ہے ایک بڑے فوجی افسر کا ملازم تھا۔ نانوتہ اس رات فوجی افسروں کی ایک محفل میں نیم عریاں حالت میں رقص کر رہی تھی۔ اس کا بیان ہے کہ وہ اس وقت بہت اچھی لگ رہی تھی۔ دفعتاً وہ ناچتے ناچتے ایک گوشے میں پہنچی اور وہاں سے اُن افسروں پر ٹامی گن سے فائرنگ کرنے لگی۔ جیلانی نکل بھاگا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ آٹھ دس آفیسر تو اس کے سامنے ہی ڈھیر ہو گئے تھے۔ باہر نکلا تو اوپر جاپانی طیارے گرج رہے تھے۔ انہوں نے بمباری شروع کر دی۔ اس کے بعد کئی حالات اسے یاد نہیں اور اب جیلانی کو بڑی حیرت ہے کہ وہ اتنا بڑا کیسے ہو گیا۔ مونچھیں ڈاڑھی کیسے نکل آئیں..... کیا وہ سولہ سال کی عمر سے اب تک سوتا رہا ہے۔

”تو وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔“ حمید نے پوچھا۔

”مکمل طور پر..... اُسے وہ زمانہ قطعی یاد نہیں ہے جب سردانش نے اُسے فٹ پاتھ سے اٹھا کر آسمان پر پہنچایا۔ حد یہ ہے وہ کہتا ہے کہ اس بمباری والی رات کے بعد سے اس نے پھر کئی نانوتہ کو نہیں دیکھا۔“

”حالانکہ ابھی حال ہی میں عیش کرتا رہا ہے۔“ حمید ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔

”جب اس سے کہا گیا کہ نانوتہ کی تصویر اس نے بنائی تھی تو وہ بگڑ گیا ہے۔ کہنے لگا کہ آپ

لوگ ایک ایسے آدمی کا مصحفہ کیوں اڑاتے ہیں جس کا دنیا میں کوئی نہ ہو۔“

”کہیں آلو تو نہیں بنا رہا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ اسی موقع پر یادداشت بھی واپس آگئی۔“

آجی کہانی بڑی طرح مشہور ہوئی ہے۔ کئی ماہرین نفسیات اس کے لئے چکر لگاتے رہے تھے۔ اب ایک صاحب وہاں ہسپتال میں اس کے سر پر مسلط ہیں۔“

یہ دونوں بیگم تنویر کے ساتھ ہسپتال پہنچے اور ویننگ روم میں بیٹھ کر صوفیہ کو اطلاع بھجوائی۔ صرف صوفیہ کو مریض کے ساتھ رہنے کی اجازت ملی تھی۔ ملاقاتیوں کو جانے سے روکا جاتا تھا۔

دفعتاً صوفیہ دوڑتی ہوئی آئی۔ وہ خوش نظر آرہی تھی۔ ”اوہ آئی..... وہ آج پہلی بار بولے ہیں..... پروفیسر تاج نے کہا تھا کہ ہوش میں آنے کے بعد جو کچھ بھی ان کی زبان سے نکلے نوٹ کر لینا۔ میں نے..... لکھ تو لیا ہے..... لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ان الفاظ کا مطلب کیا ہے۔“

”لایئے..... دیکھو۔“ فریدی نے ہاتھ بڑھایا..... اس نے کاغذ کا ٹکڑا اُسے دے دیا۔ حمید بھی دیکھنے کے لئے جھکا۔ اس پر تحریر تھا۔

”چنڈو بے یوک نے ولے..... پیسے پیسے کے دو ٹوہا۔“

فریدی تھوڑی دیر تک اُسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”یہ تو برمی زبان کے الفاظ ہیں..... دو الگ الگ جملے دونوں کا محل استعمال مختلف ہے۔ پہلے کا مطلب ہے میں کہاں ہوں..... اور دوسرے کا مطلب..... بھاگو بھاگو بچاؤ۔“

صوفیہ بے اعتباری سے فریدی کی طرف دیکھنے لگی۔ فریدی نے پوچھا۔ ”کیفیت کیا ہے۔“

”بس اتنا ہی بول کر خاموش ہو گئے ہیں اور پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہے ہیں۔ اچھا میں اب جا رہی ہوں..... کہیں وہ پریشان نہ ہوں۔“

وہ چلی گئی اور بیگم تنویر براسا منہ بنائے اُسے جاتے دیکھتی رہیں۔

”یہ لڑکیاں؟“ انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”پاگل ہوتی ہیں پاگل..... پہلے یہ اس سے متفرق

تھی..... دونوں میں روزانہ جھگڑا ہوتا تھا۔ پھر جب اُسے کچھ لوگ اٹھالے گئے تو پاگل ہو گئی۔ رو

رو کر آنکھیں سجالیں اور اب رات دن ایک کر رہی ہے، دیوانی.....!“

”آپ بہتر سمجھ سکتی ہیں۔“ فریدی مسکرایا اور حمید ایک دلدوز آہ بھر کر اٹھ گیا تھا۔



تین دن تک وہ اس کیس کے نشیب و فراز میں الجھے رہے۔ حمید صبح سے کرئل وارڈ کے

”ایسے ہی مواقع تو ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے تو نانوہ کی تصویر لاشعور سے شعور میں پہلی آئی تھی۔ یہ واقعہ بھی اسی طرح پیش آیا وہ گاہ وہ پچھلے تجربات جن کا تعلق نانوہ سے ہو یا دواشہ کھو بیٹھنے کے بعد کی کسی سچویشن سے اچانک آکھرائے ہوں اور صرف نانوہ اس کے شعور میں پھسل آئی ہو۔ لیکن پوری سچویشن یاد نہ آئی ہو۔ پھر جیتی جاگتی نانوہ سامنے آئی۔ اس کی موجودگی میں بہتیرے پچھلے تجربات لاشعور میں کلبلا کلبلا کر رہ گئے ہوں گے۔ اس نے ان ادھوری ذہنی جھلکیوں کو مربوط کرنا چاہا ہو گا۔۔۔ لیکن کامیابی نہ ہونے پر بیہوشی کے دورے پڑنے لگے ہوں گے۔ پھر نانوہ نے اُسے گھر بھجوا دیا ہو گا۔ دوسری چیز شراب بھی تو تھی۔ تم نے ہی بتایا تھا تم خود سوچو کتنی اذیت ناک ہو گی واپس آتی ہوئی یادداشت کی ادھوری غیر مربوط اور بیجان انگیز جھلکیاں جنہیں وہ کوئی معنی نہیں پہناسکتا تھا۔“

”ہو گا۔۔۔“ حمید کان جھڑک کر بولا۔ ”آخر ہم کب تک اپنی یادداشت کھو بیٹھنے کے قابل ہوں گے۔ آئے دن تو بھانت بھانت کے حادثات سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ یہی ہو جائے کچھ دنوں تک موج میں سارگی بجاتے پھریں۔۔۔ اور آئی جی صاحب سے کہیں معاف کیجئے گا۔ ہم نے آپ کو پہچانا نہیں۔۔۔ خیر سارگی پر والدین کا خیال سنئے۔ طبلے پر فریدی صاحب سنگیت کر رہے ہیں آہم یہ تو آپ نے ابھی تک بتایا ہی نہیں کہ انگوٹھی کا کیا قصہ تھا۔“

فریدی نے آصف والا واقعہ دہراتے ہوئے کہا۔ دراصل وہ انگوٹھیاں نانوہ کے لئے آدی مہیا کرنے کا باعث بنتی تھیں۔ اچھے پڑھے لکھے اور تندرست نوجوان کو راہ چلتے پڑی ہوئی ملتیں وہ انہیں اٹھا کر انگلیوں میں ڈال لیتے اور پھر انہیں گیت سنائی دیتے وہ اسے آسانی عمل سمجھ کر پریشان ہوتے لیکن انگوٹھی کی طرف دھیان نہ جاتا۔ پھر کرمل وارڈ کے ایجنٹ انہیں کرمل وارڈ جیسے ماہر روحانیات تک پہنچا دیتے اور پھر انہیں نانوہ کا دھوئیں والا مجسمہ دکھایا جاتا اور وہ اس کے عشق میں پاگل ہو کر خود ہی وادی میں اتر جاتے تھے۔ وہ ان سے کہتی تھی وادی کا جیک میں آؤ۔۔۔ میں تمہیں وہیں ملوں گی۔۔۔ اس طرح اس نے ڈیڑھ ہزار تندرست مزدور مہیا کئے تھے اور ان سے کام لے رہی تھی۔ بہر حال اسے جو کچھ یہاں سے لے جانا تھا وہ تو پہلے ہی زیر ولینڈ پہنچا چکی تھی اب خود بھی نکل گئی۔“

”آپ تو کہہ رہے تھے کہ مر گئی۔“

”ہاں مر ہی گئی مگر مجھے اس کی اطلاع نہ دی گئی۔ پوسٹ مارٹم کے لئے لاش ہسپتال میں پہنچا دی گئی اور وہ مردہ خانے سے صاف نکل گئی۔“

”صاف نہیں نکل گئی لاش نکل گئی۔ آپ کے سننے میں فرق آیا ہے۔“ حمید جھلا گیا۔

”تھریا اور نانوہ دونوں ہی جس دم کے ماہر ہیں۔ اسی طرح تھریا بھی ایک بار عمران کو دوج دے کر نکل گئی تھی۔ وہی حربہ نانوہ نے یہاں آزمایا۔ پہلے مجھے خیال نہیں آیا تھا ورنہ حکام کو اس خطرے سے بھی آگاہ کر دیتا۔“

”اب بچنے آپ زیر ولینڈ! ہا۔۔۔!“ حمید نے منہ پر ہاتھ رکھ کر قہقہہ لگایا۔

”میں نے تو پکڑ کر ان کے حوالے کر دیا تھا۔ میری ذمہ داری ختم۔“ فریدی کا لہجہ ناخوشگوار تھا۔

”اب کیا ارادہ ہے حکام کو آگاہ کیجئے گا۔“

”اس سلسلے میں آپ کی زبان بند رہنی چاہئے۔ حمید صاحب میں چاہتا ہوں یہی مشہور ہو کہ لاش غائب ہو گئی۔“

دوسرے دن حمید، بیگم تنویر کے یہاں جا پہنچا وہ موجود نہیں تھیں صوفیہ نے نشست کے کمرے میں اس کا خیر مقدم کیا۔ وہ ننگے پیر تھی اور بچوں کے بل آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر حمید کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

”وہ برابر کے کمرے میں آرام کر رہے ہیں۔“ اس نے لجاجت سے کہا تھا۔ ”ذرا آہستہ سے بولے گا۔ میں بڑا خیال رکھتی ہوں کہ شور نہ ہونے پائے وہ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ دیکھئے آپ خود سوچئے۔ انہیں آرام کی کتنی ضرورت ہے۔ میں رات رات بھر جاگتی رہتی ہوں کہ کہیں بلی آکر کوئی چیز نہ گرا دے اور ان کی نیند میں خلل نہ پڑے۔ وہ مجھ سے کہتے ہیں صوفی اب سو جاؤ۔ تم بھی تو کتنی تھکتی رہتی ہو۔ میں کہتی ہوں آپ پرواہ نہ کیجئے۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔۔۔ اب آپ ہی بتائیے جناب کتنی محبت کرتے ہیں۔۔۔ راتوں کو جاگ کر کام کرتے رہتے ہیں۔۔۔ دن کو فرصت نہیں ملتی۔ آج کوئی امریکہ سے ملنے چلا آ رہا ہے۔۔۔ پرسوں جرمنی سے۔۔۔ سارا دن اسی میں ختم ہو جاتا ہے۔۔۔ پھر رات کو آرام کیسے کریں۔۔۔ رات کو کام کرتے ہیں۔۔۔ وہ دیکھئے اس تصویر کی وجہ سے وہ دنیا کے سب سے بڑے مصور ہو گئے ہیں نا! ہٹے آپ نے تو مجھے مبارک باد بھی نہیں دی۔“ وہ روٹھے ہوئے انداز میں ہنسی اور پھر سنجیدہ ہو کر

کچھ سوچتی ہوئی دانتوں سے ناخن کترنے لگی۔ اتنے میں بیگم تنویر آگئیں وہ انہیں دیکھ کر ہلکا کر اٹھی اور اندر چلی گئی۔ ”کہئے جناب کیسے تکلیف فرمائی۔“ انہوں نے پھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”جی بس جیلانی صاحب کی خیریت دریافت کرنے آیا تھا۔“

”جیلانی یہاں کہاں ہے۔“ وہ مغموم لہجے میں بولیں۔ ”اے تو ہماری شکلوں سے وحشت ہوتی ہے۔ وہ بری سفیر کی کوٹھی میں مقیم ہے۔ آج کل میں رنگوں چلا جائے گا۔ مگر صوفیہ بہک گئی ہے۔ اللہ اس پر رحم کرے آپ سے کیا کہہ رہی تھی۔“

”جی.... کچھ نہیں.... وہ تو.... آپ کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں۔“ حمید نے کہا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا.... اس کا سارا جسم جھنجھٹا اٹھا تھا۔

ختم شد

اردو فینز ڈاٹ کام